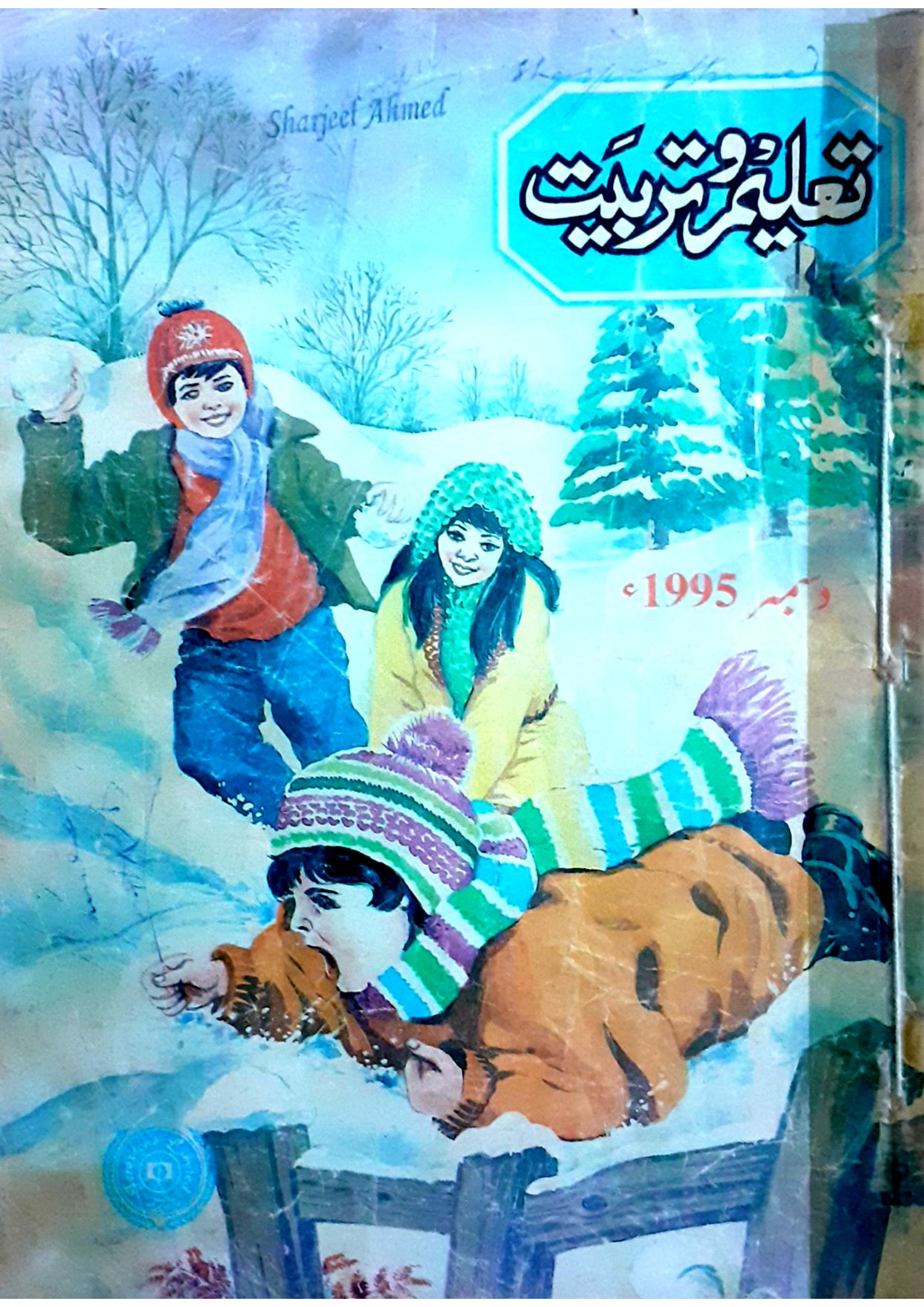

Sharjeel Ahmed
تعلیم و تربیت
دسمبر 1995ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

55 واں سال

نواں شمارہ

تعلیم و تربیت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بچوں کا محبوب رسالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السّلامُ علیکُم

25 دسمبر اُس عظیم راہ نُما کی تاریخ پیدائش ہے، جس نے برِّصغیر کے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور اُن کے لئے ایک آزاد و خود مُختار ملک ------ اِسلامی جمہوریہ پاکستان ------ حاصل کیا۔ اُس کا ہم پر یہ بہُت بڑا اِحسان ہے، اور ہم اُس کے اِس اِحسان کا بدلہ اِسی صورت میں چُکا سکتے ہیں کہ اُس کی تعلیمات پر عمل کریں اور پاکستان کو صحیح معنی میں پاکستان بنائیں۔

پاکستان بننے کے بعد قائدِاعظمؒ نے پاکستانی قوم سے کہا تھا: "آپ کو چاہئے کہ اپنی صفوں میں ویسا ہی اِتحّاد قائم رکھیں جیسا کہ پاکستان حاصل کرتے وقت موجود تھا۔ آپس کے جھگڑوں اور صُوبائی نفرت سے اپنے آپ کو دُور رکھیں۔ اگر ہم اِکٹھے رہے تو بہُت سی خرابیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں"۔

فوٹو گرافی کے مقابلے کے لئے ہمیں بہُت سی تصویریں موصول ہوئی ہیں۔ لیکن اکثر ساتھیوں نے ہماری ہدایات پر عمل نہیں کیا۔ ہم نے کہا تھا کہ تصویر رنگین اور پوسٹ کارڈ سائز کی ہو۔ بعض ساتھیوں نے بلیک اینڈ وائٹ تصویریں بھیج دیں اور بعض نے پاس پورٹ سائز کی۔ اِس مہینے ہم چار تصویریں چھاپ رہے ہیں۔ اگر اچھی اور دلچسپ تصویریں آئیں تو تعداد بڑھائی جا سکتی ہے۔

اِس شمارے میں

اداریہ		1	دلچسپ اور عجیب		34
قائدِاعظم (نظم)	نزہت شاہجہانپوری	2	الگاکون تھے؟ (مضمون)		35
پوٹلی (کہانی)	فوزیہ طاہرہ	3	دو مددگار	ڈاکٹر رضوان ثاقب	36
رنگے ہاتھوں (کہانی)	اشتیاق احمد	7	سرسید کی والدہ (مضمون)	زبیدہ سلطانہ	41
پیتل اور سونا (کہانی)	سید نظر زیدی	11	علمی آزمائش		43
درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	17	آیئے مسکرائیں (لطائف)		45
حضرت عیسیٰ (مضمون)		18	نتیجہ بلا عنوان		46
سنہری چڑیا	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	19	باتیں بڑوں کی		47
صحیح فیصلہ (کہانی)	رفعت شاہین	21	آپ بھی لکھیے		48
ریل گاڑی (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	25	آپ کا خط ملا		54
اور برف گرتی رہی (کہانی)	سلیم خان گمی	26	دو سردار (کہانی)	محمد یونس حسرت	57
کوا کہانی (نظم)	مسعود منور	33	ہونہار فوٹو گرافر		63
			قدرت کے عجوبے		64

چیف ایڈیٹر عبدالسلام

ایڈیٹر سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر رضوان ثاقب

اشتہارات / مارکیٹنگ سید شوکت انجاز

سرکولیشن اسسٹنٹ محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر: ظہیر سلام

پرنٹر عبدالسلام

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60- شاہراہِ قائدِاعظم لاہور

سالانہ قیمت
پاکستان میں (معہ رجسٹری کے ساتھ)
-/319 روپے
مشرقِ وسطیٰ/افریقہ (ہوائی ڈاک سے)
-/515 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے)
-/715 روپے
امریکہ/مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)
-/735 روپے

قیمت فی پرچہ -/15 روپے

دسمبر 1995

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- شاہراہ بن بادیس لاہور فون: 6361309-6361310 6278815-6278816

فرحت شاہ جہان پوری

قائدِ اعظم پیارے پیارے

قائدِ اعظمؒ، پیارے پیارے
آنکھ کا نُور تھے، دِل کے سہارے

پاکستان دِلایا ہم کو
زِندہ قوم بنایا ہم کو
قائدِ اعظمؒ کا یہ کَرَم ہے
آج جہاں میں اپنا بھَرَم ہے
آزادی کی نِعمت دی ہے
عِزّت دی ہے، عظمت دی ہے
ہم نے خوب ترقّی کی ہے
پاکستان کو رونق دی ہے

قائدِ اعظمؒ کی ہو تمنّا
پُھول سے بچّو، یاد یہ رکھنا

پیارے بچّو، خوب پڑھو تم
آگے رہو تم، آگے بڑھو تم
ہِمّت تم ہو، طاقت تم ہو
اپنے وطن کی زِینَت تم ہو
اپنے وطن کی خِدمَت کرنا
کوشش کرنا، مِحنَت کرنا
قائدِ اعظمؒ کا یہ چمن ہے
اُن کا چمن، یہ اپنا وطن ہے

اِس کی شان بڑھاتے رہنا
پاکستان سجاتے رہنا

پوٹلی

فوزیہ طاہرہ

بِلال بڑی دیر سے بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اگرچہ ایسا روز ہی ہوتا تھا، لیکن آج اُسے زیادہ انتظار کرنا بُرا لگ رہا تھا۔ بس اِسٹاپ پر لوگوں کا ہُجوم بڑھنے لگا تھا۔ جو بس بھی آتی وہ اِس قدر لدھی پھندی ہوتی کہ رُکے بغیر ہی گزر جاتی۔ وہ جانتا تھا کہ گھر دیر سے پہنچنے پر اُس کی ماں پریشان ہوتی ہے۔ کیوں کہ اُس کا ایک ہی تو کماؤ پُوت تھا۔ اُس کے باقی پانچ بہن بھائی اُس سے عُمر میں چھوٹے تھے۔ اُن میں سے تین تو بہُت چھوٹے تھے، جب کہ دو بھائی اِسکول میں پڑھتے تھے۔

بلال دن بھر ایک ورک شاپ میں کام کرتا اور شام کی شِفٹ میں اِسکول جاتا۔ آج وہ اِس لیئے بھی جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا کہ اُس کے ماسٹر صاحِب نے اُس کی کاپی پر شاباش لکھا تھا۔ جب اُس کی ماں یہ پڑھے گی تو کتنی خوش ہو گی۔ وہ یہ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرا دیا۔

اِتنے میں ایک بس اُس کے قریب آکر رُکی۔ لوگ دھکم پیل کرنے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ بھی چڑھ ہی گیا۔ بس مُسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اُس نے سیٹ کے لیئے اِدھر اُدھر نِگاہ دوڑائی۔ لیکن سِوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اِتنا رش تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ بس کا دُھواں کھڑکیوں کے راستے اندر داخل ہو رہا تھا۔ قریب بیٹھے ایک بڑے میاں کا تو کھانس کھانس کر بُرا حال ہونے لگا۔ بس ایک اِسٹاپ پر رُکی تو کچھ مُسافر اُتر گئے۔ اب کہیں کہیں خالی سیٹ نظر آنے لگی تھی۔ بلال نے بھی موقع غنیمت جانا اور جھٹ پچھلی سیٹ پر ایک شخص کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"بیٹا، تمھیں کہاں جانا ہے؟" اُس شخص نے بِلال سے پُوچھا۔

"جی...... طارِق روڈ۔ آپ کو کہاں جانا ہے؟" بلال نے بھی سوال کر ڈالا۔ جانے کیوں اُسے یہ شخص اپنا اپنا سا لگا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ اور بھی باتیں

کرے۔

"بیٹا' طارق روڈ سے اگلے اِسٹاپ کے قریب ہی ایک کچّی آبادی ہے۔ بس وہیں میرا گھر ہے" اجنبی مسافر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بلال نے اپنے بارے میں اجنبی کو بتایا کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کی بیماری کی وجہ سے ایک ورک شاپ میں کام کرتا ہے۔ اُس کی ماں سِلائی کڑھائی کرتی ہے اور یوں دونوں ماں بیٹا مِل کر گھر کی گاڑی چلا رہے ہیں۔ اُسے خاص طور پر یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اجنبی مُسافِر' جس نے اپنا نام سعید بتایا تھا' ریڈیو پاکستان میں مُلازِم ہے۔ اُسے ریڈیو اِسٹیشن دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اُس نے جھٹ بستے میں سے کاپی پنسل نکالی اور سعید صاحِب کا پتا لکھنے لگا۔

"انکل' آپ مجھے ریڈیو اِسٹیشن دکھائیں گے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں' بھئی۔ کیوں نہیں۔ جس دن تمہیں جانا ہو' میرے گھر آ جانا۔ میں تمہیں ریڈیو اِسٹیشن لے چلوں گا۔ میرا پتا تو تم نے لکھ ہی لیا ہے"۔

ایک اِسٹاپ پر بس رُکی۔ کچھ مسافر اُترے' کچھ چڑھے۔ اُن میں ایک معذُور شخص بھی تھا جو بیساکھی کے سہارے کھڑا تھا اور اِدھر اُدھر خالی سیٹ تلاش کر رہا تھا۔ بلال سے نہ رہا گیا۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُسے اپنی سیٹ پر بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔ معذُور شخص دُعائیں دیتا ہُوا سعید صاحِب کے ساتھ بیٹھ گیا۔

بلال کو رہ رہ کر اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا' جو اُس کے گھر دیر سے پہنچنے پر پریشان ہو رہی ہو گی۔ آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی فِکر مند رہنے لگی تھی۔ وہ جب بھی صبح کو کام کے لئے گھر سے نکلتا تو وہ اُس کی سلامتی کی دُعائیں مانگتی نہ تھکتی۔

شہر میں دہشت گردی اور مار دھاڑ نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ شہر کی رونقیں ختم ہو چکی تھیں۔ جو گھر سے نکلتا' اُسے واپسی کی خبر نہ ہوتی۔ ہر طرف بے یقینی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے اِس ہنستے بستے شہر کو کسی کی نظر لگ گئی ہو۔ ہر شخص اِس صورتِ حال سے تنگ تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سب لوگ ایک دوسرے کے لئے ہم دردی رکھتے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگوں کے درمیان نفرتیں پھیلانے والے کوئی اور لوگ ہیں۔

اِس دہشت گردی کے خلاف ہڑتالیں ہوئیں' امن ریلیاں ہوئیں' لیکن حالات سُدھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ بلال کی عمر اگرچہ 14 سال کے لگ بھگ تھی' لیکن وہ بھی اپنے شہر کی حالت پر کُڑھتا رہتا تھا۔

وہ سوچوں میں گُم تھا کہ ٹکٹ چیکر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

بلال نے کچھ کہے بنا جیب میں سے روپیہ نکالا اور ٹکٹ چیکر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُسی وقت بس ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ سب مسافر سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ بیچ سڑک میں بس کا یُوں رُک جانا واقعی اچنبھے کی بات تھی۔

"شاید ٹائر پنکچر ہو گیا ہے" پیچھے سے کسی مسافر نے آواز لگائی۔

ابھی لوگ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے کہ چار موٹر سائیکل سوار بس کے گِرد چکّر کاٹتے نظر آئے۔ اُنہوں نے اپنے چہروں پر نقاب پہن رکھے تھے۔ یہ دہشت گرد تھے۔ سب مسافر گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ موٹر سائیکل سوار' جنہوں نے مٹّی کے تیل کے ڈبّے اُٹھا رکھے تھے' بس پر تیل چھڑکنے لگے۔ پھر ایک دہشت گرد نے ماچس کی تیلی جلا کر بس پر پھینکی اور آن کی آن میں بس شُعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ مسافر چیخنے چلّانے لگے۔

بس دُھوئیں سے بھر گئی تھی۔ قِیامت سے پہلے قیامت آ گئی تھی۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فِکر میں تھا۔

دہشت گرد کس طرف سے آئے اور کس طرف کو چلے گئے، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ بس دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔

بلال کا بایاں بازو بُری طرح جُھلس گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے باہر نکلنے میں کام یاب ہُوا اور بڑی دیر تک فُٹ پاتھ پر بیٹھا کھانستا رہا۔ اُس کے آس پاس بہُت سے لوگ بے سُدھ پڑے تھے۔ اُسے سعید صاحِب اور وہ معذُور آدمی کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کہیں وہ بس کے اندر ہی تو نہیں پھنس گئے؟ وہ یہ سوچ کر کانپ گیا۔ کچھ لوگ بس کو جلتا ہوا دیکھ رہے تھے، لیکن خوف کے مارے آگے نہیں آ رہے تھے۔ کچھ ہِمّت والے نوجوانوں نے پولیس کو اور ہسپتالوں کو ایمبولینس کے لئے فون کیا۔ بس کا آدھے سے زیادہ حصّہ جل چکا تھا۔ بہُت سے مسافِر جو بس سے اُترنے میں کامیاب ہو گئے تھے سڑک پر پڑے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ سعید صاحب جو معذُور شخص کے ساتھ آخری سیٹ پر بیٹھے تھے، سب سے آخر میں اُترے۔ اُنہوں نے کندھوں پر اُس معذُور شخص کو اُٹھا رکھا تھا۔

بلال اُن دونوں کو بُری طرح جُھلسا ہوا دیکھ کر جلدی سے اُن کی طرف بڑھا۔ سعید صاحِب کی دونوں ٹانگیں اور سینہ جل گیا تھا۔ اُنہوں نے معذور شخص کو نیچے اُتارا اور خود بے سُدھ ہو کر فُٹ پاتھ پر لیٹ گئے۔ ہسپتال کی گاڑیاں آ گئی تھیں۔ لوگ زخمیوں کو گاڑیوں میں بٹھا رہے تھے۔ اگرچہ شام پڑ چکی تھی اور بلال کو بار بار اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا، لیکن اُس وقت زخمیوں کی مدد کرنا زیادہ ضروری تھا۔ اُس نے سعید صاحِب کو دیکھا جو فُٹ پاتھ پر لیٹے تکلیف سے بُری طرح کراہ رہے تھے۔

بلال سعید صاحِب جیسے نیک اور مہربان اِنسان کی یہ حالت دیکھ کر دُکھ سے رو پڑا۔ اُنہوں نے ایک معذور شخص کو بچانے کے لئے اِتنی تکلیف سہی تھی۔ اُن کے سرہانے ایک آدمی بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ سعید صاحب بولنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن آواز اُن کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"اِس پوٹلی میں..... ایک لاکھ روپیہ ہے۔ خدا کے لئے..... یہ میرے گھر پہنچا دیں" وہ ٹُوٹے پھُوٹے اَلفاظ میں اجنبی شخص سے کہہ رہے تھے۔

"لیکن آپ کا نام کیا ہے اور آپ کا گھر کہاں ہے؟" اجنبی اُن سے پُوچھ رہا تھا۔

"میرا گھر..... وہاں..... اِس میں زیور بھی ہے..... میری بیٹی کی..... شادی کے لئے۔ اگر تم یہ پوٹلی میرے گھر پہنچا دو تو..... تو..... تمہاری بڑی..... مہربانی..... اور..... اور..... اگر نہ پہنچا سکے..... تو..... تو..... میں نے..... میں نے..... تمہیں مُعاف کیا..... میں..... میں..... قِیامت کے دن..... تم سے..... تم سے کوئی شکایت..... شکا..... یت..... نہیں کروں گا" سعید صاحِب نے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمّل کی۔

اجنبی شخص نے پوٹلی مضبوطی سے تھام رکھی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اِس شخص کے گھر کا پتا تو مجھے معلوم نہیں' پھر میں اِس کی یہ امانت کس طرح اِس کے گھر پہنچاؤں گا۔ سعید صاحِب بے ہوش ہو گئے تھے۔ اُنہیں بھی دوسرے زخمیوں کے ساتھ ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

بلال یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنی کاپی پر لکھے ہوئے سعید صاحِب کے پتے کا خیال آیا۔

"انکل' آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ دیکھیے' میرے پاس سعید صاحب کا اڈریس ہے۔ وہ ریڈیو پاکستان میں ملازِم ہیں" بلال نے بستے میں سے کاپی نکال کر اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ اُس شخص نے پتا دیکھ کر اِطمینان کا سانس لیا۔

اُس وقت شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ سب زخمی مسافر ہسپتال پہنچا دیئے گئے تھے۔ سڑک پر ٹریفک چلنے لگی تھی' جیسے یہاں کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ بلال اب جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اجنبی شخص اُسے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر اُس کے گھر لے گیا تاکہ گھر والوں کو اِطمینان دِلانے کے بعد وہ سعید صاحِب کے گھر اُن کی امانت پہنچا سکے۔ بلال کی ماں نے بیٹے کا جُھلسا ہُوا بازو دیکھا تو تڑپ اُٹھی۔ لیکن اُس نے پوٹلی والا قصّہ سُنا تو اُسے بلال کو روکنا اچھا نہ لگا۔

بلال اور اجنبی دونوں جلد سے جلد سعید صاحِب کے گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ شکر ہے کہ گھر ڈھونڈنے میں اُنہیں زیادہ دِقّت پیش نہ آئی۔ کچّی آبادی میں داخِل ہوتے ہی دائیں جانب گلی کا پہلا مکان سعید صاحِب کا تھا۔ اجنبی شخص نے سعید صاحِب کے بیٹے کو بُلا کر سارا قصّہ سُنایا اور پوٹلی اُس کے سپُرد کی۔ سعید صاحب کا بیٹا حیران رہ گیا۔ اگر یہ اجنبی چاہتا تو پوٹلی ہضم بھی کر سکتا تھا۔ اُس میں ایک لاکھ روپے کے عِلاوہ زیورات بھی تھے۔ اُس نے اجنبی کو گلے لگا لیا۔ اُس نے بلال کا بھی شکریہ ادا کیا جس کی مدد سے یہ امانت اُن تک پہنچی۔

اگرچہ آج کے واقعے کی وجہ سے بلال کافی رنجیدہ تھا' لیکن اب اُسے اِس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ اُس کے وطن کے تمام لوگ بُرے نہیں ہیں۔ اِن میں اچھّے لوگ بھی ہیں' جو مُصیبت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اُن کا دُکھ اپنا دُکھ سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں چند بُرے لوگوں کے بُرے اِرادے بانیِ پاکستان قائدِ اعظمؒ کے اِس پیارے مُلک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک سعید جیسے عظیم لوگ اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی زندگی بچاتے رہیں گے' اور اُس اجنبی جیسے لوگ اِیمان داری کی شمع جلاتے رہیں گے' اِس ملک کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔

بلال اِنہی خیالوں میں گُم' اجنبی کے ساتھ' اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

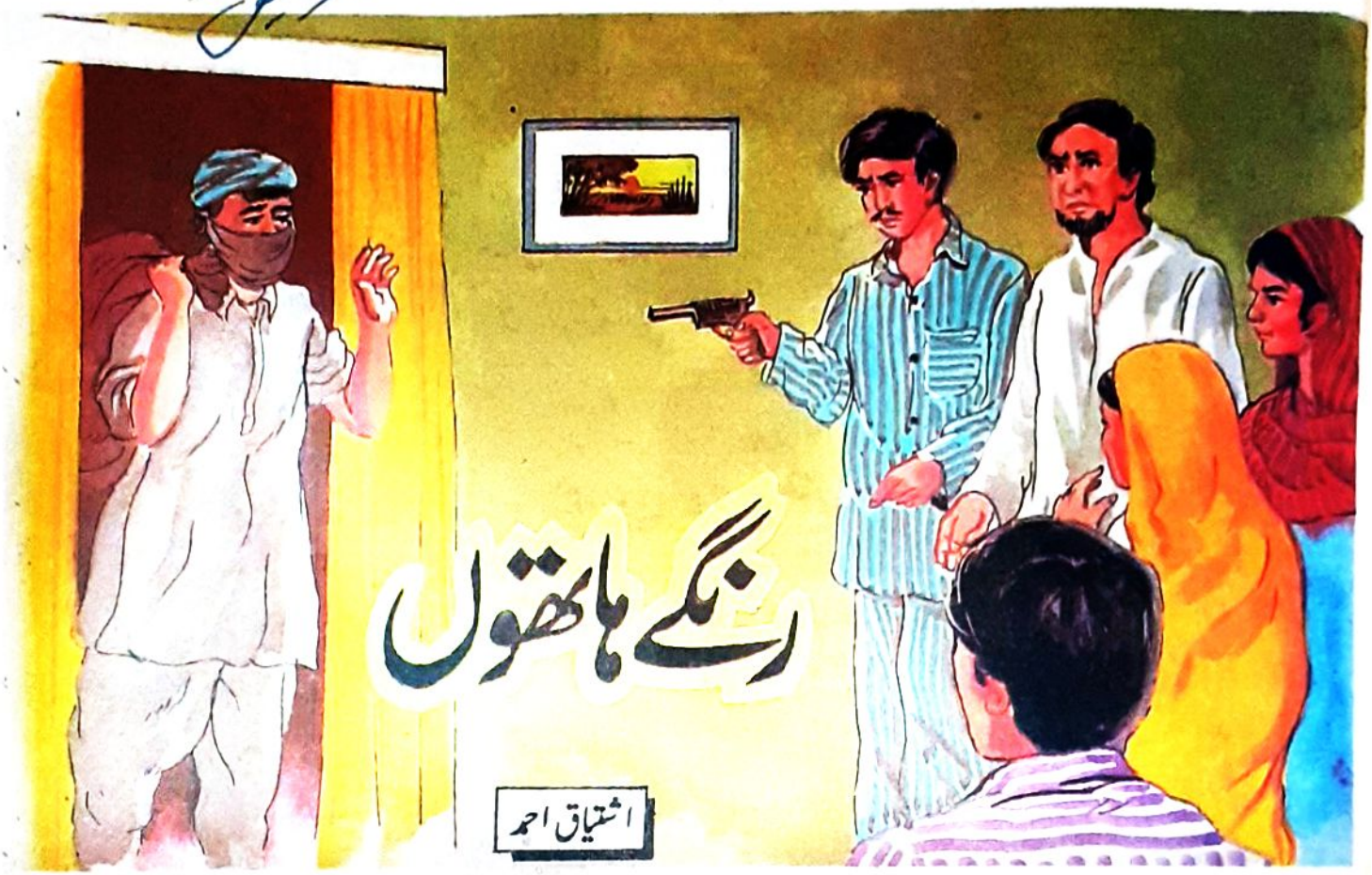

رنگے ہاتھوں

اشتیاق احمد

چور ہمارے سامنے تھا۔

اُسے ہم نے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ ہم سب گہری نیند سو رہے تھے' سوائے امّی جان کے۔ بچپن سے ہم اُن کی یہ بات سُنتے آئے تھے کہ اُن کی نیند بہت ہلکی ہے۔ ذرا سے کھٹکے سے کھُل جاتی ہے۔ اُن کی یہ بات آج دُرست ثابت ہوئی تھی۔ کھٹکے کی آواز سُنتے ہی اُن کی آنکھ کھُل گئی تھی۔ کن اکھیوں سے اُنہوں نے دیکھا' ایک چور تجوری پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُنہوں نے ابّو کا شانہ ہلا دیا۔ اُن کی آنکھ کھُلی تو اُنہوں نے امّی جان کو ہونٹوں پر اُنگلی رکھے دیکھا۔ اب ظاہر ہے وہ اِس اِشارے کا مطلب سمجھتے ہیں لہٰذا مُنہ سے کوئی آواز نکالے بغیر اُنہوں نے امّی جان کی دوسری اُنگلی کے اِشارے کی طرف دیکھا۔ وہاں چور صاحب اپنے کام میں جُٹے نظر آئے۔

ابّو بہت اِحتیاط سے اُٹھے اور آواز پیدا کئے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے امّی جان کو بھی باہر نکل آنے کا اِشارہ کیا۔ اُنہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ' باہر نکل آئیں۔ اب دونوں نے ہم سب کو جگایا۔ ابّو نے بھائی جان کو پستول نکال لانے کا اِشارہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ جب چور تجوری پر ہاتھ صاف کر کے دروازے کی طرف مُڑا تو گھر کے سب لوگ اُس کے اِستقبال کے لئے تیّار کھڑے تھے اور بھائی جان کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ پستول کو دیکھ کر چور صاحب کے چھکّے چھُوٹ گئے۔ شاید اُنہیں دانتوں پسینا بھی آ گیا ہوگا لیکن وہ ہمیں نظر نہ آ سکا۔

"السّلامُ علیکُم' جناب۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟" ابّو شگفتہ انداز میں بولے۔

"مم.... میں..... یعنی کہ میں"۔

"ہم سمجھ گئے..... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں" میں بول اُٹھا۔

"کک..... کیا سمجھ گئے؟" اُس نے کہا۔

"آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں کہ آپ بے گُناہ ہیں۔ زندگی میں پہلی بار چوری کر بیٹھے ہیں۔ وہ بھی بھُولے سے

اور یہ کہ ہم آپ کو مُعاف کر دیں۔ یہاں سے جانے دیں"
میں نے چور کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا" چور مسکرایا۔ اب وہ اپنے اوسان بحال کر چکا تھا۔

"پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ہم سُننے کی ہِمّت رکھتے ہیں" ابّو بولے۔

"میں ایک عادی چور ہوں..... عادی چور نہ ہوتا تو آپ کے گھر میں کس طرح داخل ہوتا؟ تالے کس طرح توڑتا؟ یہ پہلا موقع نہیں ہے میں نے اَن گِنَت چوریاں کی ہیں۔ ہاں، یہ پہلا موقع ہے کہ گھر کے لوگ جاگ گئے ہیں۔ شاید آپ لوگ گہری نیند نہیں سوتے؟" چور نے کہا۔

"سوتے بھی ہیں، نہیں بھی سوتے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے" ابّو نے جواب دیا۔

"میں آپ کا سامان جُوں کا تُوں فرش پر رکھ رہا ہوں..... آپ میرا راستہ نہ روکیں..... راستہ روکنے کی صورت میں نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا ہے" چور بولا۔

"کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" بھائی جان نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیا آپ ہمیں دھمکی دینے کا اِرادہ فرما رہے ہیں؟" ابّو بولے۔

"یہ دھمکی نہیں، مشورہ ہے۔ اگر آپ میرا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے تو میں بھی آسانی سے آپ کے قابو میں نہیں آنے والا۔ مطلب یہ کہ خون خرابا ہوگا۔ پستول اور خنجر میرے پاس بھی ہیں۔ یہ دیکھیں"۔ یہ کہہ کر اُس نے پنڈلی پر سے شلوار اُوپر سرکائی۔ وہاں خنجر اُڑسا ہوا تھا۔ اب اُس نے قمیص ہٹا کر دکھائی۔ کمر میں پیٹی بندھی تھی اور اُس میں پستول تھا۔

"لیکن ہمارے مُحترم چور صاحِب، اگر آپ پستول نکالنے یا خنجر چلانے کی کوشش کریں گے تو اس سے پہلے میں فائر کر دوں گا، اور آپ آرام سے ڈھیر ہو جائیں گے" بھائی جان نے مسکرا کر کہا۔

"میں اِتنا آسان شکار نہیں ہُوں۔ بتا چکا ہُوں کہ ماہر چور ہوں۔ اچّھا یوں کریں، آپ ایک فائر مُجھ پر کر کے دیکھ لیں۔ فائر میری ٹانگوں پر کریں۔ اگر مجھے گولی لگ گئی تو میں خود کو آپ لوگوں کے حوالے کر دوں گا۔ نہ لگی تو آپ مجھے جانے دیجئے گا"۔

"نہ بھئی۔ میں گولی نہیں چلاؤں گا۔ اِنسانی خون بہانا

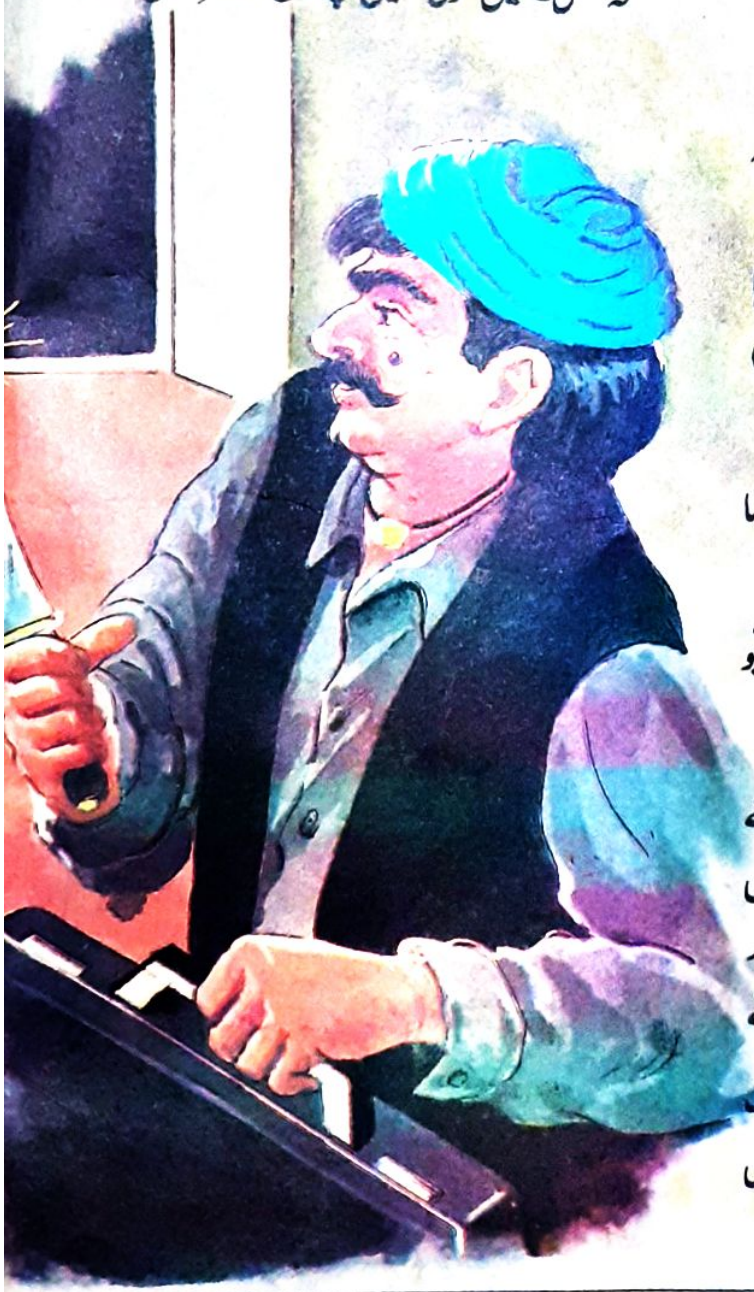

میرے لئے بہت مشکل ہے" بھائی جان نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ..... یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟" میں چلّا اُٹھا۔

بھائی جان کی بات سُن کر چور شیر ہو گیا۔ اُس نے اچانک پستول پیٹی میں سے نکال لیا اور غرّا کر بولا:

"آپ کے لئے اِنسانی خون بہانا مشکل ہے، لیکن میرے لئے آسان ہے۔ لہٰذا میرا راستہ چھوڑ دیں بس۔ بہت باتیں ہو گئیں۔ آپ کا مال چھوڑے جا رہا ہوں۔ بلکہ نہیں، اب تو بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ میں مال کیوں چھوڑ کر جاؤں؟" یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ ہم خوف زدہ انداز میں پیچھے ہٹے۔ اُس نے جلدی جلدی زیورات اور دوسری چیزیں اُٹھائیں اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ ایسے میں میں چلّا اُٹھا:

"ارے! یہ پستول تو نقلی ہے..... کھلونا پستول ہے"۔

"کیا؟" سب چلّائے۔ اُدھر چور بُری طرح اُچھلا۔

"خبردار! اب تم ہاتھ اُوپر اُٹھا دو اور سامان نیچے رکھ دو" ابّو گرجے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے چور نے خنجر کھینچ لیا۔

لیکن اُسی وقت کرکٹ کی گیند تیر کی طرح اُڑتی ہوئی آکر اُس کے ہاتھ سے ٹکرائی۔ خنجر اُچھل کر دُور جا گرا۔

"بس! اب کوئی رِعایت نہیں ہو گی۔ میرا بیٹا اِنسانی خون بہانے سے ڈرتا ہے۔ لیکن میں تم پر گولی چلانے میں ذرا نہیں ہچکچاؤں گا..... ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ" ابّو نے کہا۔

چور کے ہاتھ اُوپر اُٹھ گئے۔ اُس کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔ بھائی جان نے آگے لپک کر خنجر اُٹھا لیا۔ عین اُسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم چونک اُٹھے۔

"یہ اِس وقت کون آ گیا؟" بھائی جان بڑبڑائے۔

"شوکی، تم دیکھو جا کر" ابّا جان بولے۔

میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ دروازے پر پہنچا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا "کک..... کک..... کون؟"

"پپ..... پپ پولیس! ہماری معلومات کے مُطابق اِس طرف کوئی چور آ گیا ہے۔ وہ کہیں اِس گھر میں تو نہیں ہے؟" ایک پولیس والے کی آواز آئی۔

"بہت اچھے موقعے پر آئے..... واہ جی واہ!....." میں نے خوش ہو کر دروازہ کھول دیا۔

باہر تین کانسٹیبل کھڑے نظر آئے۔

"تو کیا چور اندر ہے؟" ایک کانسٹیبل نے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ اندر آئیے۔ ہم نے اُسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے اور اب آپ اُسے رنگے ہاتھوں لے جائیں"۔

"بہت خوب! مزہ آ گیا" اُن میں سے ایک بولا۔

میں اُنہیں اندر لے آیا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

"اوہ! یہی ہے وہ۔ اِس کی تلاش میں تو ہم پندرہ دن سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اِس کے ہاتھ کمر پر باندھ دو اور اِس کو تھانے لے چلو" ایک کانسٹیبل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"کیوں جناب؟ آپ کے پاس ہتھکڑی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہمیں ہتھکڑی نہیں ملی" اُس نے کہا۔

چور کے ہاتھ کمر پر باندھ دیئے گئے۔ اُس کی کمر کے گرد بھی رسّی کس دی گئی اور اُس رسّی کا باقی حصّہ دو سپاہیوں نے پکڑ لیا۔

"اب اِسے تھانے تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔ آپ لوگ صبح آکر رپورٹ پر دستخط کر دیجئے گا"۔

"لیکن جناب' آپ ایسے کس طرح جا سکتے ہیں؟ آپ نے تو وقت پر آکر ہم سب کے دِل جیت لیے ہیں۔ کم از کم چائے تو ضرور پی کر جائیں۔ گھر میں کچھ مٹھائی بھی موجود ہے" میں نے کہا۔

"اوہ! بہت بہت شکریہ۔ لیکن ذرا جلدی۔ ہمیں تھانے پہنچ کر رپورٹ درج کرنا ہے"۔

گھر کے لوگ مجھے گھورنے لگے۔ شاید اِن حالات میں میرا اُنہیں چائے کی دعوت دینا ناگوار گزرا تھا۔ لیکن اب وہ چائے کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ امّی جان کو باورچی خانے کا رُخ کرنا پڑا۔

"چلئے' میں آپ کا ہاتھ بٹھاتا ہوں تاکہ چائے جلدی تیار ہو جائے" میں نے کہا اور اُن کے پیچھے نکل گیا۔

دس منٹ بعد میں اور امّی چائے تیار کر کے لے آئے۔ کانسٹیبل چائے اور مٹھائی پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ اچانک بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی۔ سب نے چونک کر دیکھا تو کمرے کے دروازے پر ایک پولیس اِنسپکٹر اور آٹھ کے قریب کانسٹیبل نظر آئے۔ اِنسپکٹر صاحِب کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"تم چاروں ہاتھ اُوپر اُٹھا دو!" پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"کیا مطلب؟ یہ سب کیا ہے؟" بھائی جان گھبرا کر بولے۔

"یہ تینوں پولیس والے نقلی ہیں اور اِس چور کے ساتھی ہیں" میں نے شوخ آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سب ایک ساتھ بولے۔

"اِس کے تینوں ساتھی باہر اِس کا اِنتظار کر رہے تھے۔ یہ ایسے ہی موقعوں کے لئے باہر کھڑے رہتے ہوں گے تاکہ اِن کا ساتھی پھنس جائے تو یہ نقلی پولیس والے اِسے چُھڑا لائیں"۔

"لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ اور اصلی پولیس والے کس طرح یہاں پہنچ گئے؟" ابّا جان بولے۔

"جب تینوں نقلی پولیس والے اندر آئے تو چور نے اُنہیں آنکھ ماری۔ لیکن اُن کی آنکھ کا اِشارہ میں نے دیکھ لیا اور اِسی لئے میں نے فوری طور پر اُنہیں چائے کی دعوت دی' تاکہ اُنہیں روک لیا جائے۔ پھر میں امّی جان کے ساتھ چائے تیار کرانے کے بہانے باہر گیا۔ باہر آکر امّی جان کو میں نے ساری بات بتائی اور شیخ صاحِب کے ہاں جا کر پولیس کو فون کر دیا۔ یہ ہے کُل کہانی"۔

"اِس کا مطلب ہے کہ یہ چاروں بُری طرح پھنس گئے ہیں" بھائی جان بولے۔

"کوئی ایسے ویسے..... ویسے آپ کے بیٹے شوکی کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رہے گا" اِنسپکٹر صاحِب نے ہنس کر کہا اور میں شرمانے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

پیتل اور سونا

سیّد نظر زیدی

ماں باپ نے تو شاید یہ سوچ کر ذی شان علی نام رکھا تھا کہ بیٹا تعلیم حاصل کر کے اور اچھّی عادتیں اپنا کر اُونچا رُتبہ حاصل کرے گا اور اِس کی وجہ سے خاندان کا نام روشن ہوگا۔ لیکن اِن ذیشان صاحِب نے دُوسروں پر رُعب جما کر شان حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ گھر میں اپنی بہنوں کو اور اِسکول میں اپنے ساتھیوں کو ڈرا دھمکا کر بڑا بننے کی کوشش کرتے تھے۔ کھُلی بے اِنصافی کرنا اور دوسروں کو ناحق ستانا' اُن کی عادت تھی اور اِسے وہ اپنا حق اور بہُت بڑی قابلیّت سمجھتے تھے۔

تین بہنوں کا اِکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے گھر میں اُن کا بہُت خیال رکھا جاتا تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں اُنہیں دوسروں سے زیادہ حصّہ ملتا تھا۔ ضرورت کی سب چیزیں بِن مانگے مِل جاتی تھیں اور بڑی سے بڑی غلطی اور شرارت کو یہ کہَ کر مُعاف کر دیا جاتا تھا کہ ابھی بچّہ ہے' جیسے جیسے بڑا ہوگا' سمجھ آتی جائے گی۔

پورے گھر میں ایک دادی امّاں تھیں جو اِن ذیشان میاں کی عادتوں کو پسند نہ کرتی تھیں اور انہیں روکتی ٹوکتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں' اِس لئے اُنہیں ڈانٹ ڈپٹ کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

اِسکول کے ساتھیوں پر رُعب جمانے میں ذیشان میاں اِس لئے کام یاب رہتے تھے کہ ایک تو خوب موٹے تازے تھے' دوسرے پولیس کے ایک بڑے افسر کے صاحِب زادے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ دونوں باتیں' یعنی طاقت وَر ہونا اور ایک افسر کے گھر پیدا ہونا' اللہ پاک کی خاص مہربانی کی وجہ سے تھیں۔ ذیشان میاں کا فرض تھا کہ دوسروں کی مدد کر کے اِن نِعمتوں کا شکر ادا کرتے۔ شریف اور سمجھ دار لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن وہ تو دوسروں کو ستا کر خوش ہوتے تھے۔

یوں تو اُن کا بدتمیز اور ایک بُرا لڑکا ہونا اُن کی ہر بات سے ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن اسلم کے ساتھ اُن کا بُرا سُلوک اور بھی بُرا تھا۔ یہ شریف اور محنتی لڑکا اُن کی بیوہ خالہ کا بیٹا تھا۔ اُس کے والِد صاحِب بھی پولیس کے افسر تھے' جو ڈاکوؤں سے مُقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اپنا فرض ادا کرنے کے عِوَض حکومت نے اُنہیں بھاری اِنعام دیا تھا لیکن اُن کا کوئی ایسا رشتے دار نہ تھا جو کم عُمر اسلم اور اُس کی والِدہ صاحِبہ کی دیکھ بھال کرتا۔ اِس لئے ذیشان کی والدہ صاحبہ نے اپنی بیوہ بہن کو اپنے پاس بُلا لیا تھا اور اپنی کوٹھی کا ایک حصّہ اُنہیں دے دیا تھا جہاں ماں بیٹا بہُت عزّت اور آرام سے رہ رہے تھے۔ اُنہیں اگر کوئی پریشانی ہوتی تھی تو ذیشان کی بدتمیزی اور شرارتوں کی وجہ سے ہوتی تھی۔

اسلم کو خاص طور سے ستانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بہُت اچھّا بچّہ تھا۔ خدا نے جیسی پیاری شکل صورت دی تھی' ویسی ہی اچھّی اُس کی عادتیں بھی تھیں۔ وہ خوب صاف سُتھرا رہتا تھا۔ اپنی کتابیں اور دوسری سب چیزیں سلیقے سے رکھتا تھا اور گھر کے نوکروں تک کی عزّت کرتا تھا۔ بعض کہانیوں میں آتا ہے کہ شہزادی یا شہزادہ بات کرتا تو

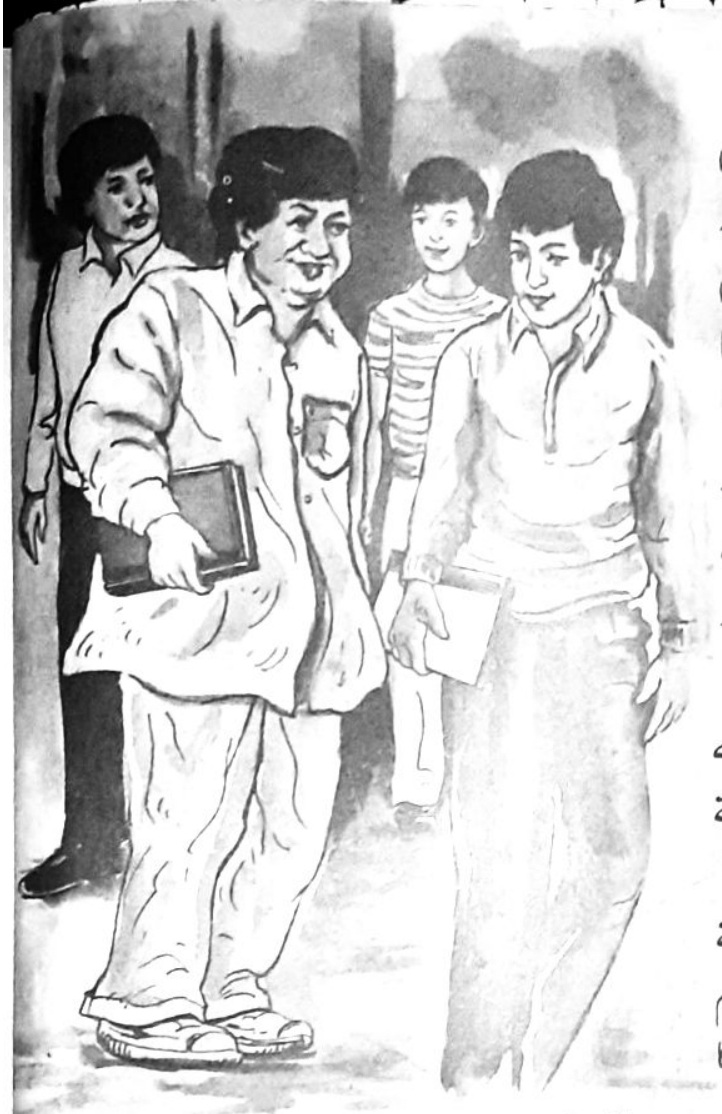

اُس کے مُنہ سے پھول جھڑتے۔ یہ بات اسلم کی گفت گو سُن کر سمجھ میں آتی تھی۔ وہ ایسے ادب اور تمیز سے بولتا تھا کہ لگتا تھا اُس کے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اِن اچھائیوں کے عِلاوہ اُس کی ایک اور بڑی اچھائی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔

اِدھر ذیشان صاحِب کی ساری باتیں بِالکُل اُلٹ تھیں۔ اُن کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے بہترین لباس بھی اُن کے بدن پر بدنُما بن جاتا تھا۔ یہی حال اُن کی کتابوں' کاپیوں اور دوسری چیزوں کا تھا۔ صفائی سُتھرائی اور سلیقے نام کی کوئی بات اُن کے رہن سہن میں نظر نہ آتی تھی۔ پڑھنے لکھنے کے مُعاملے میں تو یہ بے ڈھنگا پن اور بھی زیادہ تھا۔ پڑھتے لکھتے کم اور کتابیں اور کاپیاں خراب زیادہ کرتے تھے۔

ظاہر ہے' ایسی صورت میں سب اسلم ہی کو اچھّا سمجھتے تھے۔ جب بھی اِن دونوں کے بارے میں گفت گو ہوتی' اسلم کی تعریفیں کی جاتیں اور ذیشان کی بد تمیزیوں اور شرارتوں کا رونا رویا جاتا اور وہ اپنی عادتیں ٹھیک کرنے کے بجائے چِڑ کر کچھ اور بد تمیز بن جاتے۔

جس کسان نے زمین تیآر کر کے وقت پر بیج بویا ہوتا ہے' اُس کے کھیتوں میں فصلیں لہلہاتی ہیں۔ جس نے ایسا نہیں کیا ہوتا' اُس کے کھیت کھلیانوں میں دُھول اُڑتی ہے۔ یہی حال طالب عِلموں کا ہوتا ہے۔ شوق اور محنت سے پڑھنے والے بچّے ترقّی کے زینے پر چڑھتے چلے جاتے ہیں اور بے پروا اور نکمّے جاہل رہ جاتے ہیں اور در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

ذیشان اور اسلم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہُوا۔ میٹرک تک تو خیریُوں رہا کہ زیادہ اور کم نمبر لینے کے فرق کے ساتھ یہ دونوں ہی پاس ہوتے رہے اور ذیشان میاں کا رُعب داب بھی باقی رہا۔ لیکن کالج میں جا کر وہ فرق ظاہر ہو گیا جو اِن دونوں میں تھا۔ ذیشان پیٹو ہونے کی وجہ سے کافی موٹا ہو گیا۔ اُس کے لباس اور شکل صورت میں کچھ اور بھی بے ڈھنگا پن آگیا۔ لمبے اُلجھے ہوئے بالوں سے اُس کا ماتھا ڈھکا رہتا اور پالش کے بغیر جوتوں' اِستری کے بغیر پتلون اور گہرے رنگ کی قمیص میں وہ بِالکُل کارٹون لگتا۔ عقل اُس کی بدن سے بھی زیادہ موٹی ہو گئی۔ اُس کا زیادہ وقت اُن آوارہ لڑکوں کے ساتھ گزرتا تھا جو صرف تفریح کے لئے کالج آتے تھے۔

اُس کے مُقابلے میں اسلم پہلے سے زیادہ خوب صورت اور چُست چالاک نظر آتا تھا۔ اُسے بچپن سے ورزش کرنے کا شوق تھا۔ اب یہ شوق ایک طرح کا فرض بن گیا تھا اور اِس کے نتیجے میں اُس کے رگ پٹھے فولاد بن گئے تھے۔ اب اُس کے دو ہی شوق تھے۔ ایک تو بہت محنت سے تعلیم حاصل کرنا اور دوسرا ورزشی کھیلوں میں حصّہ لینا۔

ذیشان کے میٹرک تک پہنچنے کا قصّہ یہ تھا کہ اُس کے ابّا جان کا پولیس افسر ہونا اُس کے کام آجاتا تھا اور اُسے اِتنے نمبر مل جاتے تھے کہ اگلے درجے میں چلا جائے۔ اُس کے ابّا جان ایسے آدمی نہ تھے کہ اپنے بیٹے کو پاس کرانے کے لئے

کسی پر زور ڈالتے، لیکن اُن کے عُہدے کا رُعب کچھ ایسا تھا کہ اِمتحان لینے والے اُستاد ذی شان کو رِعایتی نمبر دے دیتے تھے۔ میٹرک کے اِمتحان میں یہ رِعایت باقی نہ رہی تھی۔ اِس کا عِلاج خود ذیشان نے ڈھونڈ لیا تھا۔ کچھ پیسے خرچ کر کے اُس نے ایک ایسا ساتھی ڈھونڈ لیا جو بُوٹی سِسٹم کا ماہر تھا۔ وہ پرچیوں پر لکھے ہوئے سوالوں کے جواب حاصل کر لیتا تھا اور یوں وہ میٹرک پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کالج میں تعلیم کا طریقہ اِسکول سے بالکل الگ تھا۔ یہاں ذیشان کو اپنے ساتھیوں پر رُعب جمانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کیوں کہ یہاں زیادہ طالبِ عِلم ایسے تھے جن کے ماں باپ ذیشان کے ماں باپ سے زیادہ امیر اور ملک کے بڑے لوگوں سے جان پہچان رکھنے والے تھے۔ اِس کے عِلاوہ ایک بات یہ بھی ہوئی تھی کہ اُس کے والد صاحِب ریٹائر ہو گئے تھے اور اُن کا وہ رُعب داب ختم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ

اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھا کرتا تھا اور یہ خیال کیا کرتا تھا کہ وہ پڑھے یا نہ پڑھے، اُس کے ابّا جان اُسے بڑا افسر بنوا دیں گے۔ یہ بات بھی اُس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ یُونین بنا کر شور مچانے والے طالب علموں کو دوست بنا کر وہ گڑ بڑ میں تو حصّہ لے سکتا ہے، تعلیم میں ترقّی نہیں کر سکتا۔ اور جب تعلیم میں ترقّی نہیں کر سکتا تو اِمتحان میں پاس بھی نہیں ہو سکتا۔

ساتھی لڑکے اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ پاس ہونا کچھ مشکل کام نہیں۔ کتابی کیڑا بننے والوں سے ہم زیادہ نمبر لے کر پاس ہوں گے۔ لیکن یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور اُس نے کالج سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دی تھیں۔ اُس کے نزدیک شرمندگی سے بچنے کا صِرف یہی طریقہ تھا۔

اب اِتّفاق ایسا ہُوا کہ اُنہی دِنوں اُس کے ایک ایسے رشتے دار پاکستان آئے جو بہُت دن پہلے سعودی عرب چلے گئے تھے اور اُنہوں نے وہاں بہُت ترقّی کی تھی۔ عزیزوں سے ملنے کے عِلاوہ اُن کے پاکستان آنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ کسی ایسے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے جو اُن کا عزیز ہو اور اُن کے ساتھ سعودی عرب جا سکے۔

ذی شان کی امّی کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اِس کوشش میں لگ گئیں کہ اُن کے بیٹے کو پسند کر لیا جائے۔ ایک تو اِس وجہ سے کہ اُس کی اُلٹی پُلٹی عادتوں سے سبھی تنگ تھے۔ اُن کا خیال تھا نئی جگہ جا کر وہ ایک اچھّا اِنسان بن جائے گا۔ اِس کے عِلاوہ اِس سے بھی اچھّی بات یہ تھی کہ امیر آدمی کی اکلوتی بیٹی سے شادی ہو گی تو وہ بھی خوب امیر ہو جائے گا۔

ذی شان کے یہ امیر رشتے دار اُنہی کے گھر ٹھہرے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیوی اور بیٹی بھی تھی اور یہ سبھی بہُت اچھّے تھے۔ ذیشان کی امّی نے اُسے اُن کے پاکستان آنے کا مقصد بتایا تو وہ بہُت خوش ہُوا۔ اُس نے امّی سے کہا "اچھّی امّی جان، جس طرح بھی ہو سکے، آپ مجھے اِن چچا کے ساتھ

سعودی عرب بھجوا دیجیے۔ مجھے لگتا ہے میں وہاں خوب ترقی کروں گا اور آپ کو بھی اپنے پاس بُلا لوں گا۔ آپ وہاں ہر سال حج کیا کریں گی"۔

امّی بولیں "بیٹے' میری کوشش تو یہی ہو گی کہ تمہارے یہ چچا تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن بیٹے' اِس بات پر بھی تو غور کرو کہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ تم کسی شریف گھرانے کے بچّے ہو۔ کتنی مُدّت سے سمجھاتی آ رہی ہوں کہ اپنی حالت ٹھیک کرو اور شوق سے تعلیم حاصل کرو۔ لیکن تم تو میری باتوں پر دِھیان ہی نہیں دیتے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تمہاری جگہ وہ اسلم کو لے جائیں گے۔ ماشاء اللہ اُس کی عادتیں بھی اچھّی ہیں اور دیکھنے میں بھی شریف گھرانے کا لگتا ہے"۔

"چھوڑیئے بھی' امّی جان۔ وہ تو ہر وقت اچھّا بننے کی ایکٹنگ کرتا ہے۔ اس لئے سب کو اچھّا لگتا ہے۔ آپ کوشش کریں گی تو کام یابی میرے ہی حصّے میں آئے گی۔ میں کوشش کروں گا کہ چچی جان اور چچا جان پر اسلم کی اصلیت ظاہر ہو جائے" ذیشان نے کہا۔

امّی حیران ہو کر بولیں "بیٹے' اِس سلسلے میں تُو کیا کوشش کرے گا بھلا؟ اچھّے کو بُرا ثابت کرنا آسان تو نہیں اور پھر یہ اچھّی بات بھی تو نہیں ہے"۔

"آپ دیکھیے تو میں کیا کرتا ہُوں" ذیشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اگرچہ اسلم کی امّی نے اِس سلسلے میں کوئی بات نہ کی تھی' ساری بات سُن کر وہ چُپ ہو گئی تھیں لیکن مہمان خاتون نے ایک دن خود ہی کہا "بہن جی' آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم لوگ پاکستان کیوں آئے ہیں"۔

"ہاں بہن' معلوم تو ہُوا ہے کہ آپ کے آنے کا خاص مقصد ریحانہ بیٹی کے لئے کوئی اچھّا رشتہ تلاش کرنا ہے"۔

"جی' بہن جی۔ ہم نے یہ لمبا سفر اِسی لئے کیا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے بہن کہ ریحانہ کے ابّو خاندان کے لڑکوں میں کسی ایسے لڑکے کی تلاش میں ہیں جو گھر داماد بن کر رہ سکے اور ہمارا کاروبار سنبھالنے کی قابلیّت بھی رکھتا ہو۔ ہمارا کوئی بیٹا تو ہے نہیں' ہمارا داماد ہی ہمارا وارِث ہو گا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسلم کو ہمارا بیٹا بنا دیں۔ اگر آپ نے یہ بات مان لی تو ہم آپ کو بھی اپنے ساتھ سعودی عرب لے جائیں گے اور اِن شاء اللہ آپ وہاں ہر طرح خوش رہیں گی"۔

اسلم کی امّی تو خود یہ چاہتی تھیں۔ اُنہیں ریحانہ بہت پسند آئی تھی۔ لیکن ابھی اُنہوں نے ریحانہ کی امّی کو جواب نہ دیا تھا کہ ریحانہ کے ابّو وہاں آ گئے اور اپنی بیوی سے بولے "بیگم' اگر کوئی ضروری بات نہ کر رہی ہو تو تھوڑی دیر کے لئے ہمارے ساتھ چلو"۔

ریحانہ کی امّی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ کہتی ہُوئی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئیں "بہن جی' میں ابھی آتی ہُوں۔ میری بات پر غور کیجیے گا اور دیکھیے مایوس نہ کیجیے گا مجھے"۔

ریحانہ کے ابّو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اُس کمرے میں گئے جس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "بیگم' ہمارا خیال ہے کہ تم اسلم میاں کے بارے میں اُن کی امّی سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ کہیں بات تو پکّی نہیں کر لی؟"

"جی نہیں۔ بس بات کی تھی اور وہ جواب دینے والی تھیں کہ آپ آ گئے"۔

"اچھّا ہُوا بات آگے نہیں بڑھی۔ ہم نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ یہ اسلم صاحِب تو سندُوری آم ہیں جو دیکھنے میں جتنا اچھّا لگتا ہے' اُتنا ہی کھٹّا ہوتا ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صاحِب زادے سخت آوارہ ہیں۔ بات تو اچھّی نہ تھی' لیکن ہم نے اُن کی الماری اور میز کی تلاشی لی تو کتنی ہی ایسی چیزیں نکلیں جو آوارہ لڑکوں کے پاس ہی ہوتی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ذیشان میاں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اُن کی طبیعت میں بے پروائی ضرور ہے لیکن کوئی اور عیب نہیں۔ سال چھ مہینے ہمارے ساتھ رہیں گے تو بے پروائی کی عادت بھی ختم ہو جائے گی اور ہمارے کاروبار کے بارے میں ضروری باتیں بھی سمجھ لیں گے۔ اِس کے بعد شادی کر دیں گے"۔

"لیکن مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسلم میاں کو بُرا ثابت کرنے کے لئے کسی نے وہ چیزیں اُن کی الماری اور میز کی درازوں میں رکھ دی ہوں۔ اچھّا' یہ تو بتایئے کہ آپ سے یہ کہا کس نے تھا کہ اسلم بُرا لڑکا ہے؟" ریحانہ کی امّی نے کہا۔

"ذیشان نے۔ باتوں باتوں میں اسلم کا ذکر آیا تو اُس نے یہ بات بتائی اور تحقیق کرنے پر ثابت ہو گیا کہ اُس نے جو کچھ کہا ہے' ٹھیک ہے۔ ماشاء اللہ اب تو ہمارے اِس بیٹے نے اپنا حُلیہ بھی ٹھیک کر لیا ہے" ریحانہ کے ابّو نے کہا۔

ریحانہ کی امّی بولیں "اگر یہ بات آپ تک ذیشان صاحِب نے پہنچائی ہے تو اِس میں ضرور کچھ گڑ بڑ ہے۔ میں یہ بات محسوس کر رہی ہوں کہ ذیشان کی امّی اور وہ خود ریحانہ سے رشتہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اپنے اُلجھے ہوئے لمبے بال بھی اُنہوں نے اِسی لئے کٹوائے ہیں اور ڈھنگ کے کپڑے بھی اِسی لئے پہننے شروع کر دیئے ہیں"۔

"ہاں' بھئی۔تمہاری بات سمجھ میں تو آتی ہے۔ ہو سکتا ہے اسلم میاں کو بُرا ثابت کرنے کے لئے وہ چیزیں خود

ذیشان نے اُن کی الماری اور درازوں میں رکھ دی ہوں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اِن دونوں کے اچھّا یا بُرا ہونے کا فیصلہ ہم کیسے کریں گے؟" ریحانہ کے ابّو نے کہا۔

"ہم یہ فیصلہ بالکُل آسانی سے کر سکتے ہیں۔ آپ دونوں کو ساتھ بٹھا کر اِس طرح اِمتحان لیں کہ اُنہیں یہ معلوم نہ ہو کہ اُن کا اِمتحان لیا جا رہا ہے۔ یہ بات پکّی ہے کہ آوارہ بچّے پرلے درجے کے نکمّے اور نالائق ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کی جگہ آوارہ گردی میں وقت برباد کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے دو چار سوالوں ہی میں معلوم ہو جائے گا کہ آوارہ کون ہے اور شریف کون" ریحانہ کی امّی نے یقین بھری آواز میں کہا اور ریحانہ کے ابّو نے اُن کی یہ بات مان لی۔ خوش ہو کر بولے "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی دونوں کا اِمتحان لیتے ہیں"۔

بُزرگوں نے کہا ہے کہ پیتل پر سونے کا پانی چڑھا کر تھوڑی دیر کے لئے تو دھوکا دیا جا سکتا ہے کہ یہ سونا ہے' لیکن پیتل کو سونا نہیں بنایا جا سکتا۔ پیتل پیتل ہی رہتا ہے۔ بالکل اِسی طرح کوئی نالائق اور بُرا آدمی جھوٹ بول کر اپنے آپ کو کچھ دیر کے لئے اچھّا ثابت کر سکتا ہے لیکن سچ مچ اچھّا نہیں بن سکتا۔ ایسی عزّت اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے تو بالکُل چھوٹی عمر سے محنت کرنی پڑتی ہے۔ جو بچّے اچھّی عادتیں اپناتے اور خوب محنت سے تعلیم حاصل کرتے ہیں' وہی افسر بن کر اُونچی کرسیوں پر بیٹھتے اور دوسری کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ نکمّوں کے ہاتھ بدنامی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں آتا۔

اِن نام کے ذیشان صاحب کے ساتھ بھی بالکُل یہی ہُوا۔ ریحانہ کے ابّو نے اِمتحان لیا تو اُنہوں نے بالکل آسان سوالوں کے بھی ایسے جواب دیئے کہ سُننے والوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ اور یہ کہانی اِس طرح ختم ہوئی کہ اسلم اور اُن کی امّی جان کے پاسپورٹ اور ویزے لگوا کر ایک مہینے بعد ریحانہ کے ابّو اُنہیں اپنے ساتھ سعودی عرب لے گئے اور ذیشان صاحب ہاتھ ملتے رہ گئے۔ البتّہ یہ فائدہ اُنہیں ہُوا کہ اُنہوں نے ایک اچھّا نوجوان بننے کا پکّا اِرادہ کر لیا۔

وطن کی لاج

پُرانے زمانے کی بات ہے' یُونان میں ایک ریاست تھی' سپارٹا۔ اِس ریاست کے لوگ بہت بہادر' دِلیر اور وطن دوست تھے۔ یہاں ایک بیوہ رہتی تھی' جس کے چار بیٹے تھے۔

ایک دفعہ سپارٹا پر پڑوس کی ایک ریاست نے حملہ کر دیا۔ دُشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی سپارٹا والوں نے خوب ڈٹ کر مُقابلہ کیا اور حملہ آوروں کے دانت کھٹّے کر دیئے۔ بیوہ نے اپنے تین بیٹوں کو دشمنوں سے لڑنے کے لئے بھیجا تھا اور وہ تینوں مارے گئے تھے۔

اب بیوہ نے اپنے چوتھے اور چھوٹے بیٹے کو بھی میدان جنگ میں بھیج دیا اور خدا سے دُعا مانگنے لگی کہ اُس کے وطن کی جیت ہو۔ وہ میدانِ جنگ کی طرف اُمّید بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی کہ کوئی آکر اُسے فتح کی خوش خبری سُنائے۔ اتنے میں اُسے سپارٹا کی فوج کا ایک افسر آتا دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے پر رنج و غم کے آثار تھے۔

بیوہ نے افسر سے پُوچھا "بیٹا' جنگ میں جیت کس کی ہوئی؟"

افسر بولا "امّاں' تمہارا چوتھا بیٹا بھی وطن کی آن پر قربان ہو گیا"۔

بُڑھیا کڑک کر بولی "میں پُوچھ رہی ہوں' جیت کس کی ہوئی؟"

افسر بولا "سپارٹا جیت گیا"۔

بیوہ خوشی سے اُچھل کر بولی "پھر میرے چاروں بیٹے زندہ ہیں۔ اگر سپارٹا ہار جاتا تو میں اُنہیں دیکھ کر کیا کرتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اُنہوں نے اپنے وطن کی لاج رکھ لی۔ چلو' اب فتح کی خوشی منائیں"۔ (عاصمہ حمید)

بچوں کے لیے درسِ قرآن

بدی کی راہوں سے بچاؤ

بچوں کے لئے درسِ قرآن میں اِس دفعہ ہمارا موضوع ہے "بدی کی راہوں سے بچاؤ"۔ موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے قرآنِ حکیم کی سُورہ محمدؐ کی پہلی آیت پر غور کریں۔

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اَلَّذِینَ کَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِیلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعمَالَہُم

ترجمہ: جو لوگ کُفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اللہ اُن کے اعمال ضائع کر دے گا۔

یہاں دو بہت بُری باتوں کا ذکر ہوا ہے:

اوّل: خود کُفر کرنا، یعنی ٹھیک اور سچّی بات یا کام سے اِنکار کرنا، اچھی اور سچّی بات یا کام میں کوئی دلچسپی نہ لینا، کسی قسم کی نیکی سے مُنہ موڑنا وغیرہ۔

دوم: دوسرے لوگوں کو بھی صحیح راستے پر چلنے سے روکنا، وغیرہ۔ قرآنِ حکیم اور اِسلام کے مُطابق یہ دونوں باتیں بُری ہیں اور اِن کے کرنے والوں کے اعمال ضائع ہوں گے۔ یعنی اِن کی یہ بُری حرکتیں کسی طور بھی پھل نہ لائیں گی اور انہیں سخت سزا ملے گی۔

کُفر کا مطلب ہے: اِنکار کرنا۔ کسی اچھی بات سے اِنکار کُفر ہے۔ مثلاً" یہ بات کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، سچ بولنا بہتر ہے، عبادت کرنا اچھائی ہے، اللہ کو خوش کرنے کے لئے نیک کام کرنا، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، صحت و صفائی کا خیال رکھنا، بدی اور جہالت کو مٹانا وغیرہ، یہ سب کام اور سب باتیں اچھی ہیں اور ان سے اِنکار یا کفر نہ صرف ناجائز ہی ہے بلکہ نقصان دہ بھی ہے۔

اِسی طرح اچھے کام کرنے والوں کی مُزاحمت کرنا، ان کے لئے ناسازگار حالات پیدا کرنا، ان میں اچھے کام کا خوف پیدا کرنا، ان کی دل شکنی کرنا، وغیرہ بھی اتنی ہی بُری بات ہے۔

گویا بدی خود کرنا یا دوسروں کو اچھائی سے روکنا دونوں ہی بُری حرکتیں ہیں اور گناہ اور گھاٹے سے بچنے کے لئے اِن سے پرہیز ضروری ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

اللہ تعالیٰ قادرِ مُطلَق ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لئے کوئی کام مشکل نہیں۔ اُس نے حضرت آدم عَلَیہِ السّلام کو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا۔ اِسی طرح حضرت عیسیٰ عَلَیہِ السّلام بغیر باپ کے دُنیا میں تشریف لائے۔ آپؑ کی والِدہ کا نام مریمؑ تھا جو بہُت نیک اور عِبادت گزار خاتون تھیں۔ ایک دن ایک فرشتہ، آدمی کی شکل میں، حضرت مریمؑ کے سامنے آ کھڑا ہوا جسے دیکھ کر وہ ڈر گئیں۔ فرشتے نے بڑی مُلائم آواز میں کہا:

"مریم، ڈرو نہیں۔ میں خدا کا فرشتہ ہوں اور اُس کی طرف سے تمہارے لئے یہ خوش خبری لے کر آیا ہوں کہ تم عن قریب ایک بیٹے کی ماں بنو گی جو پیغمبر ہوگا"۔

یہ سُن کر حضرت مریمؑ نے کہا "میں تو شادی شُدہ نہیں ہوں۔ میرے ہاں بیٹا کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؟"

فرشتے نے کہا "خدا ہر بات کی قُدرت رکھتا ہے۔ وہ دُنیا کو یہ مُعجزہ دِکھلائے گا"۔

جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو آپ کے سر کے اُوپر ایک ایسا ستارہ چمک رہا تھا جسے نبی کے پیدا ہونے کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اُس وقت حضرت مریمؑ جُو دیا (جنوبی فلسطین) کے ایک مقام بَیتُ اللّحم میں رہتی تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ تیس سال کے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا رسول بنایا، آپ پر اپنی پاک کتاب اِنجیل نازل کی اور حکم دیا کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بُلاؤ اور بُرائی سے روکو۔

ایک روز حضرت عیسیٰ علیہِ السّلام ایک عبادت گاہ کے پاس سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک غریب اور پریشان حال عورت عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر دوزانو بیٹھی ہے اور لوگ اُسے پتّھر مار رہے ہیں۔ آپؑ نے لوگوں سے کہا:

رُک جاؤ! اِس غریب عورت کو پتّھر کیوں مارتے ہو؟

لوگوں نے جواب دیا "یہ عورت گُناہ گار ہے۔ اِس کی یہی سزا ہے کہ اِسے پتّھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے"۔

آپؑ نے فرمایا "یہ بات ہے تو اِسے وہ شخص پتّھر مارے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گُناہ نہ کیا ہو"۔ یہ سُن کر لوگوں کے ہاتھ رُک گئے اور غریب عورت کی جان بچ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو کئی مُعجزے عطا کیے تھے۔ آپؑ اندھوں کی آنکھیں روشن کر دیتے اور کوڑھیوں کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اُنہیں تن دُرست کر دیتے تھے۔ آپؑ شہر شہر گاؤں گاؤں پھر کر دُکھی لوگوں کی مدد کرتے اور ساتھ ہی اُنہیں ایک اللہ کی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔

اُس زمانے میں فلسطین میں یہودیوں کی اکثریّت تھی۔ مال دار یہودی دولت کے نشے میں بدمست تھے اور عبادت گاہوں کے مُجاوِر بن کر سیدھے سادے لوگوں کو لُوٹتے تھے۔ اُنہوں نے اللہ کے دین میں ایسی باتیں شامل کر دی تھیں جن کا مذہب سے دُور کا بھی تعلّق نہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اِن لوگوں کو سیدھے راستے پر آنے کو کہا تو وہ آپ کے دشمن ہو گئے اور موقع کی تاک میں لگ گئے کہ کوئی اِلزام لگا کر آپؑ کو حکومت سے کڑی سزا دِلوا سکیں۔

ایک دن حضرت عیسیٰؑ نے اِن یہودیوں سے کہا "تم پر افسوس ہے کہ تم لوگوں پر خدا کی بادشاہت کے دروازے بند

باقی صفحہ 20 پر

دانائی کی باتیں

بخیل کا خواب

سنہری چڑیا نے کہا:

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

پیارے بچّو، میں آج جو کہانی سُنانے لگی ہوں' اِس میں سبق آموز بات یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہُوا کرتا ہے کہ کسی بزرگ کی صُحبت' بات یا کسی واقعے سے انسان کی زندگی میں ایسا لمحہ آجاتا ہے جو اُس کی کایا پلٹ دیتا ہے۔

ہماری کہانی کے ہیرو کا نام تھا تو فیض بخش' لیکن تھا وہ بڑا بخیل۔ بخیل کے معنی کنجوس کے ہیں۔ لیکن قرآنِ پاک میں بخیل سے مُراد وہ بدبخت اور نا فرمان شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ نہ کرے' ماں باپ' رشتے داروں' یتیموں' غریب مردوں اور عورتوں کی مالی اِمداد نہ کرے۔ اِتنا سنگ دل ہو کہ اُسے کسی کی مُصیبت پر ترس نہ آتا ہو اور اللہ واسطے خرچ کرنے سے ڈرتا ہو۔ وہ دولت جمع کرنے میں خوشی محسوس کرتا اور اس پر فخر کرتا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ فیض بخش کو یہودی کہتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بخیل دولت دیکھ دیکھ کر خوش تو ہوتا ہے' مگر حقیقت میں اس کی خوشی جھوٹی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بخیل کی دولت اس کے دل میں خوف و غم کی آگ لگا دیتی ہے اور وہ بے چین رہتا ہے اور دل کے اطمینان کے لئے ترستا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی نظر میں بخیل لعنتی ہوتا ہے۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ فیض بخش کا ایک دوست اسے ایک بُزرگ کے پاس لے گیا۔ وہ بُزرگ قرآنِ پاک کا عالم تھا اور اس میں شب و روز غور کرنا اس کا کام تھا۔ اس کی دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہر بات قرآن پاک کے حوالے سے کرتا تھا۔ اس لئے اس کی باتیں سچّی اور پُر اثر ہوتی تھیں۔ وہ کسی سے نذرانے وغیرہ نہیں لیتا تھا۔ بلکہ خود محنت کرکے روزی کماتا تھا۔ اس بزرگ نے فیض بخش سے پُوچھا "فرمایئے' کیسے آنا ہوا؟"

فیض بخش بولا "حضرت' اللہ کا دِیا سب کچھ ہے مگر دل کو چین ہے نہ قرار۔ دل میں ہر وقت آگ سی لگی رہتی ہے۔ کچھ ایسا وظیفہ بتا دیں کہ دل کو سُکون آجائے"۔

بُزرگ نے فرمایا "سنا ہے آپ اللہ کی راہ میں کچھ خرچ نہیں کرتے' بلکہ خرچ کرنے سے ڈرتے ہیں۔ کیا یہ بات دُرست ہے؟"

فیض بخش بولا "جی ہاں۔ یہ سچ ہے"۔

بُزرگ نے فرمایا "یاد رکھو! دولت خرچ ہوتی رہے اور گردش میں رہے تو انسان کے دل کو سکون دیتی اور اس میں خوشیوں کی جنّت بسا دیتی ہے۔ اِس کے برعکس اگر دولت جمع ہو جائے تو وہ دل کو دوزخ بنا دیتی ہے۔ اگر دل کا سکون اور قرار چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو تمہیں دیا ہے' اسے اللہ تعالیٰ کے بندوں کی بھلائی کے لئے خرچ کرو۔

سود کھانا چھوڑ دو اور محنت کر کے روزی کماؤ۔ اِس کے ساتھ قرآنِ پاک کو ترجمے کے ساتھ پڑھا کرو اور صلوٰۃ یعنی نماز بھی پانچ وقت باجماعت ادا کیا کرو۔ اِن شاء اللہ تمہاری مُراد پوری ہو جائے گی"۔

فیض بخش پر بُزرگ کی باتوں کا اثر تو ہوا' لیکن وہ دولت خرچ کرنے کا ارادہ کرتا تو شیطان اُسے مفلسی کا خوف دلاتا۔ اِسی کش مکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔

وہ رات فیض بخش کے لئے بڑی مبارک تھی' جس میں اس نے ایک انتہائی خوف ناک خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ فرشتے اس کا نفس' جسے روح کہتے ہیں' قبض کرنے آئے ہیں۔ انہوں نے اس کی اس قدر پٹائی کی کہ وہ تڑپ اٹھا' روتا' چیختا' چلّاتا اور بخل سے معافی مانگتا رہا۔ لیکن فرشتے کہتے کہ تو اپنے رب کی بات نہیں مانتا تھا' آج ہم بھی تیری کوئی بات نہیں مانیں گے۔

آخر کار' فرشتے فیض بخش کا نفس یعنی روح قبض کر کے جہنّم میں لے گئے۔ فیض بخش ایک نئے پیکر میں آتشِ جہنّم میں جلنے لگا۔ فرشتے اس کے سونے چاندی کو آگ میں تپا تپا کر اس کے چہرے' پُشت اور بدن کے دوسروں حصّوں کو داغنے لگے۔ وہ تڑپتا' چیختا' چلّاتا رہا۔ صدیوں تک اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ وہ مُردوں میں تھا نہ زندوں میں۔ اور پھر اچانک اس کی آنکھ کُھل گئی۔

اب اس کی کایا پلٹ چکی تھی۔ وہ سچ مچ فیض بخش بن گیا تھا۔ اس نے اپنی ساری دولت اپنے والِدَین' رشتے داروں' ہمسایوں' محتاجوں اور غریبوں میں بانٹ دی اور کاروبار کرنے لگا۔ اس سے اس کو چین اور قرار آگیا اور اس میں سچّی خوشیوں کی جنّت بس گئی۔

فیض بخش کو اس بزرگ کی باتیں یاد تھیں۔ وہ سچّا نمازی بن گیا۔ مہمان نوازی کرنا اس کا شِعار بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کا اس پر سب سے بڑا فضل یہ ہوا کہ اس نے باقاعدہ قرآنِ پاک کا ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے عربی زبان بھی سیکھ لی۔ پھر اس نے ایک بڑے عالِم قرآن کی تفسیر پڑھنا شروع کر دی۔ چند برسوں میں وہ عالم بن گیا۔ لوگ اسے یہودی کے بجائے حاتم طائی کہنے اور اس کی عزّت کرنے لگے۔

بچّو' آپ نے غور کیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بُخل کی وجہ سے لوگ جس فیض بخش کو یہودی اور دوزخی کہتے تھے' اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری اور سخاوت کی بنا پر' وہی فیض بخش لوگوں میں صالح' عالم اور سخی مشہور ہو گیا۔

بقیہ: حضرت عیسیٰ علیہ السّلام

کرتے ہو' نہ آپ داخل ہوتے ہو۔ نہ دوسروں کو داخل ہونے دیتے ہو"۔ خدا کی بادشاہت سے حضرت عیسیٰؑ کی مُراد ایسی حکومت تھی جس کا ہر کام خدا کے دِین کے مُطابق ہو۔ مگر یہودیوں کو بہانہ مل گیا۔ وہ فلسطین کے گورنر کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ عیسیٰؑ لوگوں کو آپ کی حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہے اور وہ یہاں خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہے۔

اُن دنوں فلسطین پر سلطنتِ روما (اٹلی) کا قبضہ تھا اور ایک رومی' پونٹیس پائلیٹ' یہاں کا گورنر تھا۔ اُس نے حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبری ملے صرف دو اڑھائی سال ہوئے تھے اور ابھی صرف بارہ آدمی ایمان لائے تھے۔ اِن میں سے بھی ایک غدّار نکلا اور اُس نے آپؑ کو گرفتار کرا دیا۔ رومی سپاہیوں نے آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا اور صلیب (سُولی) پر لٹکا کر ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھونک دیں۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اِسی حالت میں آپؑ کا اِنتقال ہو گیا۔ لیکن قرآن شریف میں ہے کہ نہ آپؑ قتل کئے گئے اور نہ سُولی پر چڑھائے گئے۔ آپؑ کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ عیسائی عالموں کے مُطابق حضرت عیسیٰؑ 25 دسمبر کو پیدا ہوئے تھے۔ اِس تاریخ کو تمام عیسائی دُنیا میں آپؑ کا یوم پیدائش بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اِسے کرِسمَس کہتے ہیں۔

صحیح فیصلہ

رفعت شاہین

اِسکول میں سالانہ مینا بازار کی تیاّریاں زوروں پر تھیں۔ پڑھائی تقریباً ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ ہیڈ مسٹرس صاحِبہ نے سختی سے کہا تھا کہ پڑھائی کا کسی طرح بھی حرج نہ ہو۔ مگر اِس کے باوجود ہر کلاس میں چھٹیّوں کا سا سماں دکھائی دیتا تھا اور لڑکیاں پڑھائی سے زیادہ مینا بازار کی تیاّریوں میں زیادہ دِل چسپی لے رہی تھیں۔ اِس سلسلے میں چھٹی کلاس کی نائمہ کی بے چینی تو دیکھنے کے لائق تھی۔

"مس، میں تو ٹافیاں بیچوں گی۔ مجھے بہت مزہ آتا ہے ٹافیاں کھانے کا" وہ بڑے مزے سے بولی۔

"کھانے کا یا بیچنے کا؟" شکیلہ نے ہنس کر کہا۔

"ایک ہی بات ہے، میں خرید کر کھالوں یا کوئی اور" وہ جلدی سے بولی تو مس انجم بھی اُس کی بات پر مسکرا دیں۔

"مس ایک آئیڈیا ہے، میرے پاس" نائمہ کی دوست فِضّہ نے کھڑے ہو کر کہا "یہ نائمہ بہت اچھی شعبدہ باز ہے"۔ میرا مطلب ہے اسے کرتب دکھانا آتا ہے۔ ٹی وی پر جو شعبدہ بازی کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں، ان میں سے کئی آئٹم اس نے سیکھ لئے ہیں" فِضّہ نے تفصیل بتائی تو مس نے نائمہ سے پوچھا۔ "کیا واقعی نائمہ"۔

"نو مس.... وہ میں ایسے ہی"..... وہ جھجھک رہی تھی۔ "مس، میں سچ کہ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے ایک شو اِس کا بھی ہو جائے" فِضّہ نے کہا۔

"اسی لمحے ہیڈ مسٹرس صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ تمام طالبات ادب سے کھڑی ہو گئیں۔ "بیٹھے پلیز" انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا "کیا ہو رہا تھا؟"

"وہ میڈم، ہم مینا بازار پر گفت گو کر رہے تھے" نائمہ نے کہا۔

"میڈم، نائمہ نے ہاتھ کی صفائی کے چند کرتب سیکھے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ورائٹی پروگرام میں ایک شو اس کا بھی رکھ لیں" فِضّہ نے جلدی سے کہا۔

"یہ تو بہت دِل چسپ آئٹم ہوگا" میڈم نے کہا۔

"اگر نائمہ راضی ہو جائے تو"۔

"میڈم' فِضّہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ خواہ مخواہ" نائمہ نے جِھجھکتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے' نائمہ بیٹا آپ جھجھکیں نہیں۔ ہمارے ورائٹی پروگرام کا منافع اسکول کے فنڈ میں جمع ہوگا اور آپ کو پتا ہے کہ غریب لڑکیوں کے تعلیمی اِخراجات اِسکول فنڈ سے پورے کئے جاتے ہیں۔ کیا آپ یہ پسند نہیں کریں گی کہ"۔ "میڈم ذرا رکیں تو نائمہ فوراً" بولی "کیوں نہیں' میڈم..... اگر یہ بات ہے تو میں دل و جان سے حاضر ہوں۔ میں بہت محنت سے شو کی تیاری کروں گی" نائمہ نے پُر اِعتماد لہجے میں کہا۔

"شاباش! نائمہ" میڈم اُس کے جواب سے بہت خوش ہوئیں اور فِضّہ نے بھی فخر سے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا۔

مینا بازار والے دن اِسکول کو رنگ برنگی جھنڈیوں' غباروں اور رنگین لڑیوں سے دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ نو بجے تک اسکول میں اچھی خاصی رونق ہو گئی تھی جو ایک میلے کا سماں پیش کر رہی تھی۔ ہر جماعت نے اپنا اپنا الگ اسٹال سجا رکھا تھا۔ گول گپوں کا اسٹال کچھ زیادہ ہی پُر رونق تھا۔ نائمہ بھی ٹافیوں بھرا تھال اٹھائے' لڑکیوں کو ٹافیاں خریدنے کی دعوت دے رہی تھی کہ فِضّہ نے اُسے پکارا "نائمہ! نائمہ تم یہاں پھر رہی ہو اور میں نے تمہاری تلاش میں سارا اسکول چھان مارا مگر"۔

"پھر بھی نہیں ملی" نائمہ نے اس کا جُملہ مکمّل کر دیا۔

"تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ جانتی ہو تمہارا شو شروع ہونے میں صرف پانچ مِنٹ رہ گئے ہیں۔ چلو، مس بُلا رہی ہیں" فِضّہ اُسے کھینچتے ہوئی بولی۔

"رُکو تو سہی - یہ تم کیا بیچ رہی ہو؟" نائمہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹوکری دیکھ کر کہا۔

"یہ قسمت کی پرچیاں ہیں۔ خریدو گی؟" فِضّہ نے پوچھا۔ "خرید لیتی ہوں۔ ایک کتنے کی ہے؟" نائمہ نے پرچیوں میں ہاتھ مارا۔

"پانچ روپے کی۔ قرعہ اندازی کل ہو گی' اسمبلی میں"۔

"یہ لو پانچ روپے۔ ایک پرچی میرے نام کی نکال دو" نائمہ نے پیسے دے کر کہا۔ فِضّہ نے ایک سادہ پرچی پر نائمہ کا نام لکھا اور پرچیوں والی ٹوکری میں ڈال دی۔

"ہیں مجھے کچھ نہیں دو گی؟" نائمہ نے خالی ہاتھ گھمائے۔ "بھئی پرچی جو ڈال دی"۔ فضہ نے کہا۔ "کل تین انعام ہیں۔ پہلا وال کلاک' دوسرا گھڑی اور تیسرا فونٹن پن" فِضّہ نے تفصیل بتائی۔

چند قدم چل کر نائمہ کو کچھ خیال آیا۔ وہ فضہ کو روکتے ہوئے بولی۔ "ایک پرچی مجھے بھی تو دو' رسید کے طور پر"۔

"کیا مطلب؟" فِضّہ نے حیرت سے کہا۔

"کچھ نہیں..... مجھے ایک پرچی پر میرا نام لکھ کر دے دو' بس"۔ نائمہ نے اب ذرا ہنس کر کہا۔

"اوہو! کیا چیز ہو تم' لو' یہ پانچ روپے کی رسید" فضّہ نے پرچی بنا کر اُسے دے دی۔ نائمہ نے پرچی جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

نائمہ کا شو بہت پسند کیا گیا۔ تالیوں سے ہال گونج اُٹھا تھا سب سے زیادہ داد اسے ہی ملی تھی۔ اور مس انجم بھی بہت خوش تھیں۔ اور..... نائمہ؟ اس کا ذہن تو اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اگلے دن اسکول بہت روکھا پھیکا لگ رہا تھا۔ لڑکیاں گروپوں کی شکل میں کھڑی ایک ہی موضوع پر بات کر رہی تھیں اور یہ موضوع تھا نائمہ کا شو۔ ان کی باتوں میں بار بار نائمہ کا نام آ رہا تھا۔ لیکن نائمہ خود چپ چپ سی تھی۔ اسمبلی کا ٹائم ہو گیا تو ایک ٹیچر نے مائیک پر اعلان کیا۔ "تمام طالبات اسمبلی کے لئے آ جائیں۔ آج انعامات کی قرعہ اندازی بھی کرنا ہے۔ بغیر شور کئے گراونڈ میں جمع ہو جائیں"۔

"انعامات کے اعلان کا سن کر تمام لڑکیاں جلدی جلدی گراؤنڈ میں جمع ہونے لگیں۔ تمام کلاسوں کی قطاریں بن گئیں۔ نائمہ بھی اپنی کلاس کی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ تمام ٹیچر اسٹیج پر جمع تھیں۔ اسمبلی کے بعد مسز نادرہ نے مائیک سنبھالا۔ انہوں نے کہا۔

"انعامات کی قرعہ اندازی ہونے والی ہے۔ کل جن لڑکیوں نے قسمت کی پرچیاں خریدی تھیں ان سب کی پرچیاں اس ٹوکری میں موجود ہیں۔ ہم باری باری تین پرچیاں نکالیں گے۔ پرچی نکالنے کے لئے کوئی بچی آ جائے"۔ یہ سنتے ہی نائمہ جلدی سے اسٹیج پر جا پہنچی۔

"ہاں..... ٹھیک ہے۔ نائمہ آپ ہی پرچی نکالیں"۔ مسز نادرہ نے مسکرا کر کہا۔

نائمہ نے ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ ٹوکری میں سے پرچی نکالنے کے لئے ٹوکری میں ڈالا۔ اسی لمحے اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس نے ٹوکری میں پڑا ہوا ہاتھ منہ پر رکھ لیا اور جیکٹ کی جیب سے دوسرا ہاتھ نکال کر پرچیوں کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس کی کھانسی رکی نہیں تھی' اس لئے وہ صرف ایک ہی پرچی نکال کر مس کو دے سکی۔

"ٹھیک ہے نائمہ۔ آپ جائیں۔کوئی دوسری بچّی آ جائے' باقی دو پرچیاں نکالنے کے لئے" مس نادرہ نے نائمہ کی نکالی ہوئی پرچی کھولتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ایک دم چونکیں اور حیرت سے بولیں "ارے نائمہ' آپ کے نام کی پرچی نکلی ہے! کتنا عجیب اِتّفاق ہے..... آپ کو' پہلا اِنعام مُبارک ہو"۔ گراؤنڈ میں موجود تمام لڑکیوں نے پُر زور تالیاں بجائیں۔ مس نادرہ نے باقی کے دونوں انعامات کا اعلان کر کے تینوں لڑکیوں کو اسٹیج پر بلایا اور انہیں انعامات دیئے۔ نائمہ کو پہلا اِنعام وال کلاک ملا تھا۔

اسمبلی کے بعد فِضّہ اور نائمہ اپنی کلاس کی طرف بڑھیں۔ تو فِضّہ چُپ چُپ سی تھی۔ "کیا بات ہے' فِضّہ؟

تمہیں میرے انعام حاصل کرنے پر خوشی نہیں ہوئی کیا؟" نائمہ نے پوچھا۔

"نہیں..... بلکہ مجھے دکھ ہوا ہے۔ نائمہ تم....." فضہ جملہ مکمل کیے بغیر خاموش ہو گئی۔

نائمہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"تم مجھ سے بات مت کرو..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم..... تم نائمہ..... اِتنی گھٹیا حرکت بھی کر سکتی ہو؟" فِضّہ بہت غصّے میں تھی۔

"آخر پتا تو چلے کہ بات کیا ہے"۔ نائمہ انجان بن کر بولی۔

"یہاں بیٹھو"۔ فضہ نے اسے برآمدے کی سیڑھی پر بٹھایا۔ "اور پوچھ خود سے کہ میری ناراضی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ کلاس روم کی طرف چلی گئی۔

"ہاں' نائمہ' پوچھ خود سے..... مگر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے' تم جانتی ہو اچھی طرح فضہ کی ناراضی کی وجہ۔ ہاں نائمہ کس قدر گھٹیا حرکت کی ہے تم نے۔ اگر تمہیں ہاتھ کی صفائی میں مہارت حاصل ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ تم اس کا غلط استعمال کرو۔ کل تم اپنی دوست کی نظر میں کتنی اہم اور بلند تھی' اور آج تم نے لالچ میں آکر اپنے آپ کو اس کی نظر میں کتنا چھوٹا کر لیا ہے..... اور خدا کی نظر میں.....؟ وہ تو سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے جیکٹ کی جیب سے پرچی نکال کر ٹوکری تک لے جاتے لوگوں نے نہ سہی خدا نے تو دیکھا تھا۔ کتنا ناراض ہوا ہوگا میرا خدا..... اور میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں"۔

خدا کا خیال آتے ہی نائمہ اندر تک کانپ گئی۔ اُس نے گود میں رکھے ہوئے وال کلاک کو دیکھا۔ "صرف اِس ذرا سے وال کلاک کی خاطر میں نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ خدا کو ناراض کیا ہے۔ اپنی دوست کو ناراض کیا ہے۔ کتنی اچھی ہے میری دوست' اور خدا؟ نہیں' میں خدا کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی میڈم کو' اور سچے دل سے خدا سے مُعافی مانگوں گی۔ خدا میری مُعافی ضرور قبول کرے گا۔ وہ تو رحیم و کریم اور مُعاف کرنے والا ہے"۔

اس نے دل میں عزم کیا اور کلاک پکڑ کر اٹھ گئی۔ اس کے قدم ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے دفتر کی طرف اُٹھ رہے تھے اور برآمدے کے سُتون کے پیچھے کھڑی فضّہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی دوست نے کتنا اچھّا فیصلہ کیا تھا۔

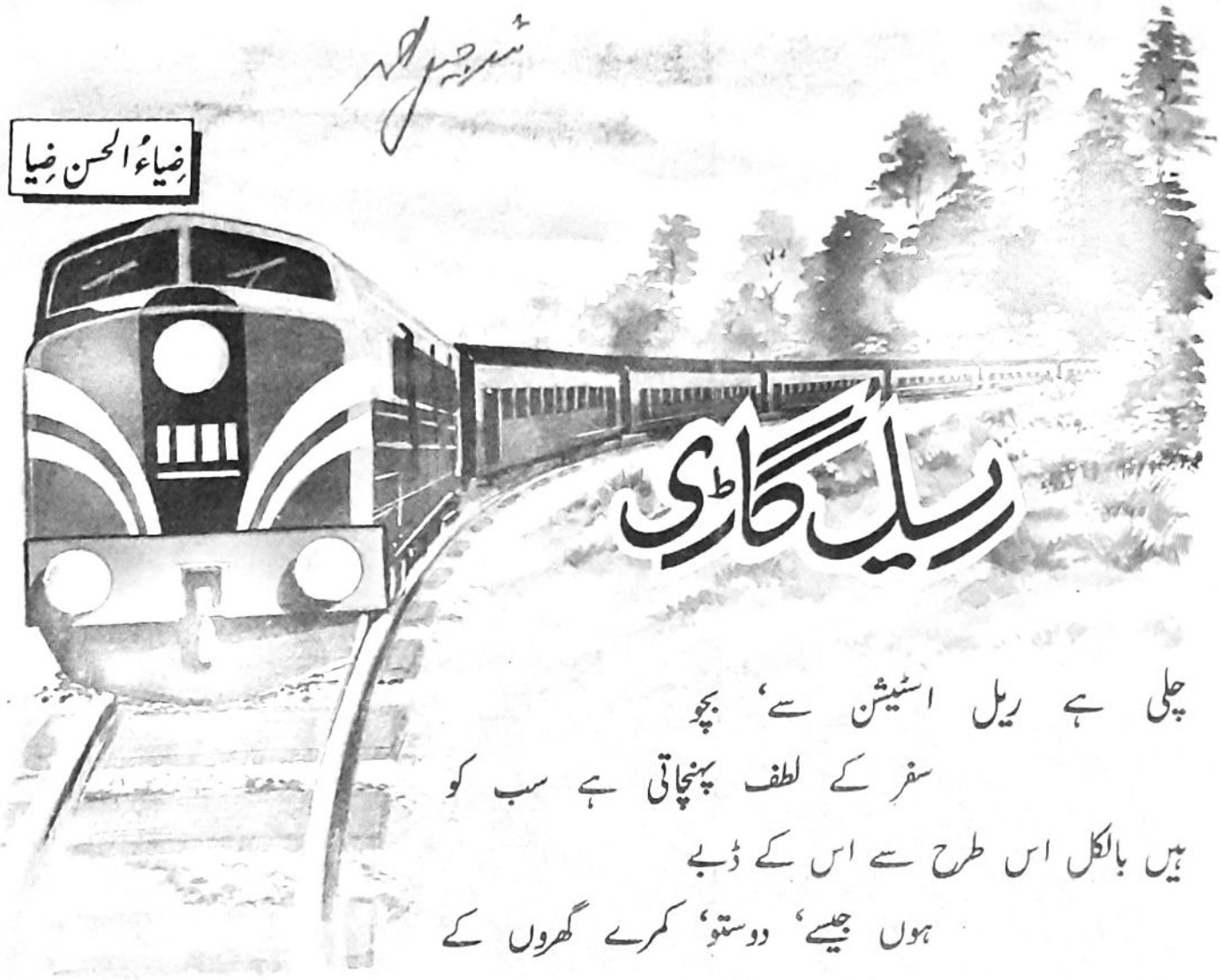

ضیاء الحسن ضیا

ریل گاڑی

چلی ہے ریل اسٹیشن سے، بچو
سفر کے لطف پہنچاتی ہے سب کو
ہیں بالکل اس طرح سے اس کے ڈبے
ہوں جیسے، دوستو، کمرے گھروں کے
حقیقت میں ہے یہ عمدہ سواری
جبھی تو ہے ہمیں بے حد یہ پیاری
گزرتی ہے کبھی یہ جنگلوں سے
کبھی دریاؤں کے اوپر پلوں سے
دکھاتی جاتی ہے کیا کیا نظارے
سبھی منظر ہیں دل کش اور پیارے
جہاں بھی دیکھتی ہے سرخ جھنڈی
اشارہ پاکے اس کا ہے یہ رکتی
سفر ہے کس قدر اس کا سہانا
ہے اس کے لطف سے واقف زمانہ

اور برف گرتی رہی

سلیم خان گمی

ہر طرف پہاڑ تھے اور پہاڑوں پر جنگل۔ یہ جنگل سفیدوں' چیڑوں' سیب اور لیچی کے درختوں کے تھے۔ اِن کے عِلاوہ ہر طرح کے پودے تھے۔ پھول دار بھی' پھل دار بھی اور کانٹے دار بھی۔ گھاس بھی بہت تھی لیکن برف میں چھُپی ہُوئی۔ وادیاں بھی تھیں اور گھاٹیاں بھی،لیکن وہ بھی درختوں سے اَٹی پڑی تھیں۔

اِن پہاڑوں' جنگلوں' وادیوں اور گھاٹیوں میں تیز ہوا چلتی تو ہر طرف سنسناہٹ دوڑ جاتی' اور جب ہوا ہلکی ہو جاتی تو چاروں طرف خاموشی چھا جاتی۔ اگر کبھی رائفل کی گولی چلتی یا توپ کا گولا داغا جاتا تو پرندے شور مچاتے اُڑجاتے۔

یہ شدید سردیوں کا موسم تھا۔ ظاہر ہے دسمبر میں ہر سال سردی پڑتی ہے۔ لیکن برف باری ہو تو سردی شدید ہو جاتی ہے اور فوجیوں کو جسم گرم رکھنے کے لئے ورزش کرنا پڑتی ہے کہ کہیں خون نہ جم جائے۔ میجر طلحہ اپنے خیمے میں ٹارچ کی روشنی میں ورزش کر رہا تھا۔ اُس کا اَردلی کبوتر خان اُس کے لئے کچن میں کافی بنا رہا تھا اور اپنے لئے چائے۔ باقی سارے افسر اِدھر اُدھر مورچوں میں بیٹھے پہرا دے رہے تھے۔ وہ سب اِس سخت سردی میں کشمیر کی کنٹرول لائن پر ڈٹے ہوئے تھے۔

کبوتر خان کافی کا مگ لے کر خیمے کے اندر آیا تو میجر طلحہ نے ورزش ختم کی' لوہے کی کرسی پر بیٹھا اور دستانے اُتار دیئے۔ کبوتر خان نے اُسے مگ دیا اور خیمے کے ایک کونے سے لوہے کی تپائی اُٹھا کر میجر کے سامنے رکھ دی۔ میجر نے مگ میز پر رکھا اور بولا "کبوتر خان' دن چڑھنے میں کتنی دیر ہے؟"

"سر' آدھی رات گزر گیا۔ پر نماز کا ٹیم ابھی نہیں ہُوا ہے"۔

"تم نے چائے پی یا نہیں؟" میجر نے پُوچھا۔

"ابھی نہیں۔ آپ کے بعد پیؤں گا' سر" کبوتر خان نے بتایا۔

"آج رات بھارتی فوج نے فائرنگ نہیں کی؟" میجر نے پوچھا۔

"نہیں سر۔ ابھی نہیں کیا۔ کر دے گا۔ اُس کو کون روکتی۔ بہت گولا بارود ہے اُس کے پاس" کبوتر خان بولا اور پھر دونوں مُٹھیاں بھینچ کر مُنہ کے پاس لایا اور اُن پر گرم سانس سے پھُونکیں مارنے لگا۔

"سردی بہت ہے، کبوتر خان" میجر نے کافی کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"سردی تو قہر کا ہے۔ چائے پیوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا" کبوتر خان بولا۔

"اور وہ تمہارے تین مجاہد، اکبر علی، غوث علی اور مرادو، اُن کا کیا حال ہے؟" میجر نے پوچھا۔

"اُن کے اُوپر نیچے کمبل ہیں۔ میں نے اپنے تین کمبل بھی اُن کو دے دیے ہیں۔ وہ سوئے ہوئے ہیں" کبوتر خان نے بتایا۔

"جاؤ چائے پیو اور پھر مجاہدوں کے لئے چائے تیار کرو۔ کچھ پتا نہیں وہ کب کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑے ہوں" میجر نے کہا۔

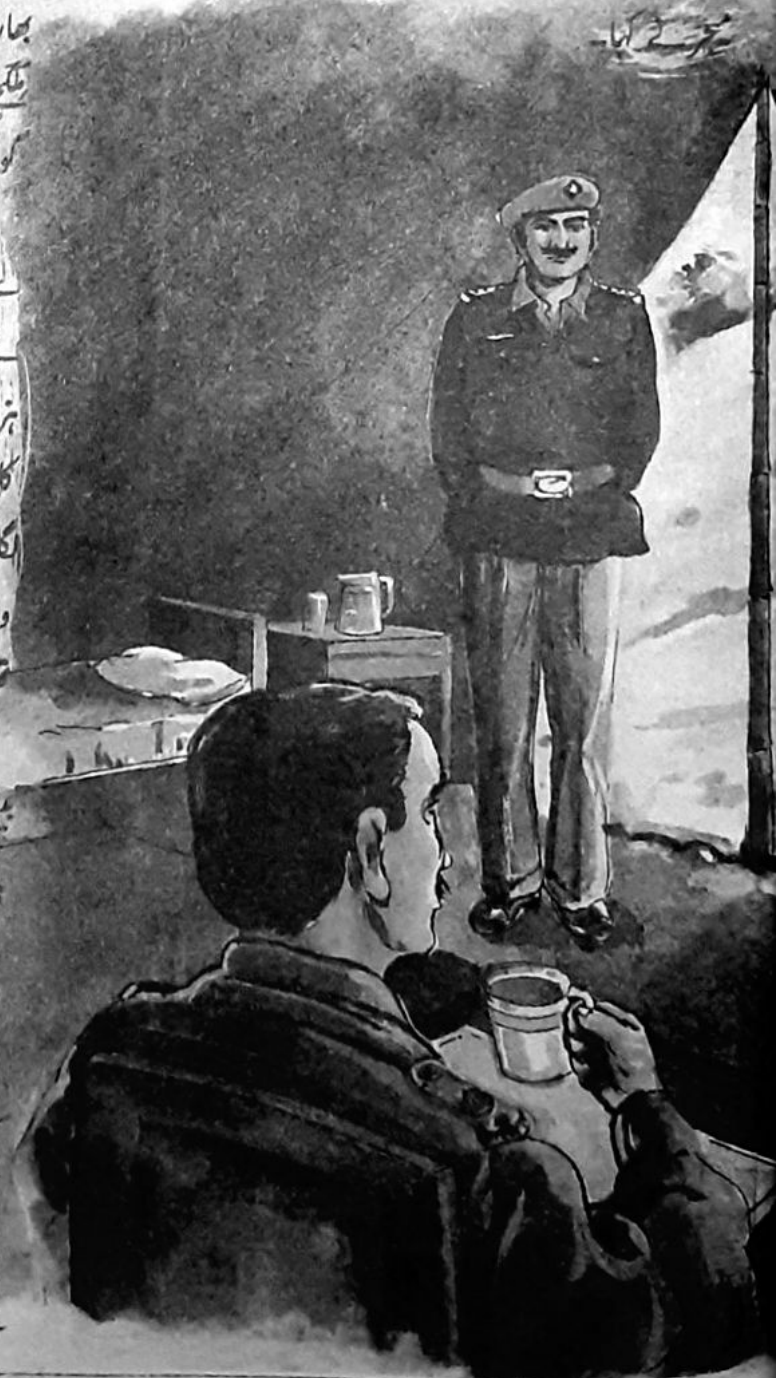

"ہاں، سر۔ پتا نہیں اُن کا۔ بادشاہ لوگ ہیں وہ" کبوتر خان جاتے جاتے بولا۔

"اُن کا اسلحہ کہاں ہے؟" میجر نے پوچھا۔

"سر، وہ ہمارے پاس ہے۔ دو کلاشنکوف، ایک پستول دس دستی بم" کبوتر خان نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ کچن میں جاؤ تم"۔

کبوتر خان خیمے سے نکل کر کچن کی طرف چل دیا اور میجر کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ برف باری شروع ہو گئی تھی اور اُس کی دھیمی سرسراہٹ سے محسوس ہوتا تھا کہ برف نہیں پڑ رہی، برف کی پُھوار پڑ رہی ہے۔ تین سو گز دور بھارتی فوج کے مورچے تھے۔ وہ بھی خاموش تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ اچانک بھارتی فوج نے روشنی کا گولا پھینکا، جس سے ہر طرف روشنی ہو گئی اور پھر اندھیرا چھا گیا۔

میجر کی کافی ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور خیمے سے باہر آگیا۔ اُس کے سامنے پہاڑی جنگل تھا یا پہاڑ۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا۔ دونوں طرف لمبے لمبے درخت بارہ ہزار فٹ اُونچے پہاڑوں پر کھڑے پہرا دے رہے تھے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ کنٹرول لائن پار کرے اور "یااللہ مدد" کا نعرہ لگا کر بھارتی فوج پر حملہ کر دے۔ لیکن اُسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ حملہ نہ کرے۔ البتّہ حملہ کرنے والوں کو روکے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس کی حکومت اقوامِ مُتّحدہ کے فیصلے کی پابند ہے۔

وہ واپس اپنے خیمے میں آ کر پھر اُسی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن ابھی ٹھیک طرح سے بیٹھ نہ پایا تھا کہ خیمے کے باہر قدموں کی چاپ سے اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سر، صوبے دار سلطان خان"۔

"اندر آ جاؤ اور کرسی پر بیٹھ جاؤ" میجر نے کہا۔

"سر، مجاہد ضد کر رہے ہیں کہ اُن کو کنٹرول لائن پار کرنے کی اجازت دی جائے" سلطان خان نے کہا۔

"وہ تو سو رہے تھے۔ کبوتر خان نے بتایا تھا مجھے" میجر بولا۔

"وہ آنکھیں مُوندے لیٹے ہوئے تھے۔ سو نہیں رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں ہمارا اسلحہ واپس کرو اور ہمیں جانے کی

اجازت دو" سلطان خان نے بتایا۔

ہم اُن کو اُن کے ہتھیار تو واپس کر سکتے ہیں کہ اُن ہتھیاروں کے لائسنس اُن کے پاس ہیں، لیکن گرینیڈ واپس نہیں کریں گے۔ کیوں کہ اُن کا لائسنس اُن کے پاس نہیں ہے۔ رہی بات جانے کی تو وہ ضرور جائیں لیکن مقبوضہ کشمیر کے شہر سری نگر کی طرف نہیں، آزاد کشمیر کے شہر مُظفّر آباد کی طرف" میجر نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔ میں اُن کو بتا دیتا ہوں" صوبیدار بولا۔

"اگر وہ مان جائیں تو اُن کے ہتھیار اُن کو دے دو گرینیڈ ضبط کر لو اور اُن کو واپس بھیج دو"۔

"یس، سر۔ لیکن سر، وہ کہتے ہیں ہمیں کشمیر میں کچھ کرنا چاہیئے" سلطان خان جاتے ہوئے بولا۔

"ہم کشمیر میں سب کچھ کریں گے۔ لیکن جب آرڈر ملے گا تب۔ اب آرڈر یہ ہے کہ کنٹرول لائن پار نہ کرو۔ لیکن بھارتی فوج کو بھی آگے نہ بڑھنے دو۔ مقبوضہ کشمیر کے اندر نہ جاؤ اور نہ کسی کو جانے دو" میجر نے کہا۔

"یس، سر" صوبیدار سلطان خان نے کہا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

میجر طلحہ تاریخ کا طالبِ علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صدیوں پہلے تُرکستان اور اِیران سے صوفیوں اور درویشوں نے کشمیر کی وادی میں آکر اِسلام کی تبلیغ کی تھی اور ہندو اور بُدھ مت کے ماننے والوں کو مسلمان کیا تھا۔ عرصے تک کشمیر کے مسلمان کشمیر پر حکومت کرتے رہے۔ پھر ہندوستان کے بادشاہ اکبر نے اِس پر قبضہ کر لیا۔ اِس کے بعد افغانستان کے پٹھان یہاں آ گئے۔ پھر پنجاب کے سِکھ مہاراجا رنجیت سِنگھ نے حملہ کر کے اِس پر قبضہ کر لیا اور جب سِکھ انگریزوں سے ہار گئے تو اُنھوں نے کشمیر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دیا اور وہ پیسہ انگریزوں کو بطور تاوان دے دیا۔ جن ہندوؤں نے کشمیر کو خریدا اُن کو ڈوگرا کہتے ہیں۔ 1947ء میں کشمیر کا ڈوگرا راجا ہری سِنگھ بھاگ گیا اور بھارت نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ جب آزادی کی لڑائی شروع ہوئی تو کشمیر کا کچھ حصّہ آزاد ہو گیا اور وہ آزاد کشمیر بن گیا۔ دوسرے حصّے پر بھارت نے قبضہ کر لیا۔ اِس کے بعد کشمیر کا جھگڑا انجمنِ اقوامِ مُتّحدہ میں گیا۔ اقوامِ مُتّحدہ نے کشمیر کے دونوں حصّوں کے درمیان جنگ بندی لائن لگا دی جسے کنٹرول لائن کہتے ہیں۔ پھر اقوامِ متّحدہ نے فیصلہ کیا کہ کشمیری ووٹ ڈال کر فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔ لیکن 48 سال گزر گئے اور آج تک ووٹ نہیں ڈالے گئے۔ اِس پر کشمیریوں نے جہاد شروع کر دیا۔

میجر طلحہ کی سوچ کی ڈوری اُس وقت ٹوٹی جب کیپٹن توصیف خیمے کے اندر آیا اور اُس نے اکڑ کر میجر کو سیلوٹ کیا۔

"بیٹھو" میجر یہ کہہ کر خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہم نے ایک کشمیری پکڑا ہے" کیپٹن نے بتایا۔

"کہاں سے؟" میجر نے پوچھا۔

"کنٹرول لائن پار کر کے ہماری طرف آ رہا تھا۔ خالی ہاتھ تھا۔ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اُسے چائے پلائی، حوصلہ دیا" کیپٹن نے بتایا۔

"جاسُوس ہے یا مُجاہد؟ کون ہے؟"

"نہ جاسوس ہے نہ مجاہد۔ کچھ بتانے آیا ہے" کیپٹن بولا۔

"پوچھنا تھا کیا بتانے آیا ہے۔ اُس کے پاس کیسی خبر ہے۔ بھارتی فوج کا تو بھیجا ہوا نہیں ہے؟ آخر کون ہے؟"

"کہتا ہے بھارتی فوج کے کچن میں برتن صاف کرتا ہوں۔ چولھے کے لئے لکڑی ڈھونڈتا ہوں۔ مسالے پیستا ہوں۔ اُس کے ہاتھ زخمی ہیں"۔

"کہتا کیا ہے؟"

"کہتا ہے، بڑے صاحب کو بتاؤں گا۔ میں اُسے آپ کے پاس لے آیا ہوں"۔

"اُسے اندر بُلاؤ، میجر نے کہا۔

"کبوتر خان، اندر لے آؤ اُسے" کیپٹن نے آواز دی۔

کبوتر خان سولہ سال کے ایک نوجوان کو اندر لے آیا۔ اُس نے میلا سا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ میجر اُٹھ کر کھڑا

ہو گیا اور کشمیری نوجوان کو کرسی پر بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔ وہ سلام کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کبوتر خان' اِس کے لئے چائے لاؤ اور بسکٹ بھی"۔

کشمیری نوجوان میجر کو گھور رہا تھا۔ پھر بولا:

"آپ بڑے افسر ہیں؟"

"بڑا تو اللہ تعالےٰ ہے۔ تم بتاؤ' تم کون ہو؟" میجر نے پوچھا۔

"میرا نام مسعود ہے' خواجہ مسعود۔ لیکن وہ مجھے ہاتو کہتے ہیں" مسعود بولا۔

"وہ کون؟" میجر نے نرمی سے پوچھا۔

"میجر جنرل جوگندر سنگھ' کرنل ورما' میجر بھاٹیہ اور دوسرے افسر"۔

"یہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟" کیپٹن توصیف نے سوال کیا۔

"اس پہاڑ کے پیچھے مورچے ہیں۔ اُن مورچوں کے پیچھے پھر مورچے ہیں اور اُن مورچوں کے پیچھے یہ لوگ رہتے ہیں' پتّھر کے گھروں میں۔ یہ ایک چھوٹی سی چھاؤنی ہے۔ وہاں میں باورچی خانے میں کام کرتا ہوں۔ لکڑی لاتا ہوں۔ درخت کاٹتا ہوں۔ کشمیری کھانے پکاتا ہوں۔ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہوں" مسعود نے کہا اور اپنے ہاتھ دیکھنے لگا جو زخمی تھے۔

"اِس طرف کیوں آئے ہو؟" میجر نے پوچھا۔

"وہ آج یا کل حملہ کرنے والے ہیں آپ پر۔ یہ بتانے آیا ہوں" مسعود سادگی سے بولا۔

"ثبوت دو" کیپٹن نے کہا۔

"میرے ساتھ چلیں اور اُس پُل کو دیکھیں جو آج رات انہوں نے مکمّل کیا ہے۔ اُس پر سے ٹینک اور توپیں آگے بڑھیں گی" مسعود نے کہا۔

کبوتر خان چائے کی ٹرے لے آیا۔ ٹرے میں چائے کے تین مگ رکھے تھے۔ ٹرے میز پر رکھ کر اُس نے ایک مگ اٹھایا اور میجر کی طرف بڑھایا۔

"پہلے مہمان کو دو" میجر نے کہا۔مسعود نے مگ پکڑا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ پھر وہ میجر کو دیکھنے لگا۔ قد 5 فٹ 10 انچ' بھوری مونچھیں' موٹی موٹی آنکھیں' سر پر گرم ٹوپی تھی اِس لئے وہ سر کے بال نہ دیکھ سکا۔ وہ میجر کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

"جاؤ' اکبر علی' غوث علی اور مُرادو کو لے کر آؤ" میجر نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

کبوتر خان مُجاہدوں کو لینے کے لئے چلا گیا تو کیپٹن توصیف بولا "اگر اِطّلاع دُرست ہے تو پھر ہماری تعداد کم پڑے گی۔ پُل کی تعمیر کا مطلب ہے حملہ بڑا ہوگا"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، کیپٹن۔ لیکن اور فوجی کہاں سے آئیں گے۔ ہم ہی اللہ کی راہ میں لڑیں مریں گے" میجر بولا۔

"پُل ہے کہاں؟" کیپٹن نے مسعود سے پوچھا۔

"دو مورچوں کے درمیان۔ میں اُس پر چل کر آیا ہوں۔ بہت بڑا ہے اور بہت مضبوط ہے۔ ٹینکوں کا بوجھ سہار سکتا ہے" مسعود بولا۔

"اگر یہ بات درست ہے تو حملہ بہت بڑا ہوگا" کیپٹن نے کہا۔

کبوتر خان مجاہدوں کو لے کر آگیا۔

"آپ لوگ چائے پی کر اور نماز پڑھ کر چلے جائیں۔ لیکن مظفّر آباد کی طرف جائیں، سری نگر کی طرف نہیں۔ جب ضرورت ہو گی تو آپ کو بُلوا لیں گے۔ دستی بم آپ کو نہیں ملیں گے۔ اسلحہ لے جائیں" میجر نے کہا اور مگ تپائی پر رکھ دیا۔

"ہم آپ کی پوزیشن سمجھتے ہیں، سر۔ آپ نے جو کہا، اُس کی تعمیل ہو گی۔ چائے ہم پی چکے ہیں۔ نماز پڑھ کر چلے جائیں گے" اکبر علی نے کہا۔

برف باری تھم گئی تھی اور تڑکا ہو رہا تھا۔ مسعود اچانک کرسی پر سے اُٹھا اور بولا "اکبر علی مجاہد"۔

اکبر علی خیمے سے باہر جا رہا تھا، اپنا نام سُن کر پلٹا اور مسعود کو دیکھ کر بولا:

"تم مسعود ہو؟ سری نگر والے؟"

"جی ہاں، میں مسعود ہوں۔ رمضان جُو ہوٹل والا۔ ہم سری نگر میں ملے تھے دو مہینے پہلے"۔

"تم یہاں کہاں؟" اکبر علی حیران ہو کر بولا۔

"میں بڑے صاحب سے ملنے آیا تھا" مسعود نے کہا۔

"یہ ہمارا مہمان ہے۔ آج ہی آیا ہے" میجر نے کہا۔

"سر، یہ لڑکا بہت عُمدہ کشمیری کھانے پکاتا ہے۔ میں خود سری نگر کا رہنے والا ہوں۔ اِسے خوب جانتا ہوں۔ دو مہینے پہلے ملا تھا اِس سے۔ پھر پتا چلا اِسے بھارتی فوجی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میں سمجھا کہیں مرا پڑا ہوگا"۔

"نہیں، میں زندہ ہوں" مسعود خوشی سے بولا۔

"سر، یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا، مُظفّر آباد۔ آپ کی اجازت ہو تو" اکبر علی بولا۔

"اِس کی خوشی ہے۔ آپ کے ساتھ جائے یا سری نگر جائے یا میجر جنرل جوگندر سنگھ کے پاس جائے" میجر نے ہنس کر کہا اور مسعود سے مُصافحہ کرتے ہوئے بولا "تھینک یُو مسعود۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم سچّے وطن دوست کشمیری ہو"۔

"سر، میں بھی ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔ لیفٹیننٹ اکمل میرا اِنتظار کر رہا ہوگا" کیپٹن توصیف نے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔

برف باری ذرا دیر کے لئے رُکی تھی، اب پھر ہونے لگی۔ لگتا تھا اُس میں تیزی آگئی ہے۔ کبوتر خان گرم پانی لے آیا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں پانی کی بالٹی تھی اور بائیں ہاتھ میں لوٹا۔

"سر، پانی، وضُو کے لئے" کبوتر خان نے کہا اور بالٹی اور لوٹا رکھ کر چلا گیا۔ میجر نے وضُو کیا، نماز ادا کی اور پھر قرآنِ کریم پڑھنے لگا۔

جب دن چڑھا تو میجر ٹیلی کمیونی کیشن سیکشن میں گیا اور ہیڈ کوارٹر کو بتایا کہ اِطّلاع کے مُطابق بھارتی فوج نے ایک بڑا پُل بنایا ہے جس پر سے ٹینک چل کر آزاد کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بڑے حملے کا خطرہ ہے۔ وہاں سے حکم ملا کہ حملے کے مقابلے کے لئے تیاّری کرو۔ اُس نے وہیں سے اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایتیں دیں اور اپنے مورچے میں آ کر بیٹھ گیا۔

وہ ذہنی طور پر حملے کی روک تھام کے لئے تیاّر تھا۔ اُس نے ملٹری اکیڈیمی میں جنگ کی تاریخ پر جو کتابیں پڑھی تھیں، اُن میں کئی بار اُن پُلوں کا ذکر آیا تھا جن پر شدید لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ اِس قسم کی سب سے پہلی لڑائی قدیم روم میں لڑی گئی تھی۔ لیکن وہ لڑائی تلواروں اور نیزوں کی تھی۔ آخری لڑائی غالباً اُس پُل پر لڑی جائے گی جس کے

بارے میں مسعود نے بتایا تھا۔ لیکن پُل پر لڑائی تو تب ہو گی جب ہم پُل پر ہوں گے یا ہماری توپیں پُل کا نشانہ لے کر اُسے تباہ کر رہی ہوں گی۔ لیکن پُل ہے کہاں؟ اُس نے نقشہ منگوایا اور اُسے مُحدّب شیشے سے دیکھتا رہا۔ لیکن اُس کی کوشش ناکام رہی۔ سارا علاقہ پہاڑوں، وادیوں، گھاٹیوں اور ندی نالوں سے اَٹا پڑا تھا۔ پُل کے بارے میں صرف مسعود جانتا تھا اور وہ جا چکا تھا، مُجاہدوں کے ساتھ۔ مظفّر آباد کی طرف۔

میجر اپنے مورچے میں نقشہ سامنے رکھے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لیفٹیننٹ اکمل خان آیا اور سیلوٹ کر کے بولا:

"وہ سر، وہ جو بارود تھا جس سے ہم پتھروں کو اُڑاتے تھے، وہ چوری ہو گیا ہے اور ساتھ ہی اوزار بھی"۔

"کون لے گیا اِتنا سارا بارود؟" میجر نے پوچھا۔

"سارا نہیں، کچھ۔ باقی ہمارے پاس ہے"۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اور لکھ کر رپورٹ کرو۔ کیا تم چاہتے ہو اِنکوائری ہو؟"

"یس، سر"۔

"جاؤ پھر اور کیپٹن کو رپورٹ کرو۔ میں خود پتا کروں گا"۔

اکمل نے یس سر کہا اور مورچے سے باہر نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میجر بھی مورچے سے نکلا اور ڈیوٹی پر موجود جوانوں سے ملنے کے لئے چل دیا۔

جب وہ باہر نکلا تو برف باری ہو رہی تھی اور جب وہ شام کو تھکا ماندہ واپس آیا تو برف باری تب بھی ہو رہی تھی۔ بھارتی فوج کے حملے کے کوئی آثار نہ تھے۔ لیکن سارے دن کی سوچ نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ حملہ ضرور ہو گا اور بہت بڑا ہو گا، جس میں ٹینک بھی اِستعمال ہو سکتے ہیں۔ 1948ء میں جب کشمیری مجاہد بلتستان میں لڑ رہے تھے تو بھارتی فوج سخت پہاڑی راستوں کو پار کر کے ٹینک لے آئی تھی اور اُن سے مُجاہدوں پر گولا باری کی تھی۔ خیر، وہ تو نہتّے مجاہد تھے۔ یہاں تو اُن کا آزاد کشمیر کی باقاعدہ فوج سے مُقابلہ تھا۔

ایک دم میجر کو خیال آیا کہ بارود اکبر علی اور اُس کے ساتھی مُجاہد لے گئے ہیں۔ اُن کے سِوا اور کون لے جا سکتا ہے۔ یہاں نہ کوئی آیا ہے اور نہ گیا ہے۔ اُسے یاد آیا کہ

اُس نے اکبر علی کی فائل میں پڑھا تھا کہ وہ سری نگر میں آتش بازی بناتا تھا۔ وہ کمبل میں چھُپا کر لے گیا ہوگا۔ لیکن کیا وہ اُس بارود کی آتش بازی بنائے گا؟ نہیں۔ وہ سری نگر جا کر کوئی کار روائی کرے گا۔

رات سر پر تھی اور برف باری زوروں پر۔ کیا برف باری میں حملہ ہو سکتا ہے؟ کیا برف باری میں فوج پیش قدمی کر سکتی ہے؟ برف باری کی رات دشمن کے لئے ہمیشہ فائدہ مند ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچ کر اور پریشان ہو گیا اور بے چینی سے اپنے خیمے میں ٹہلنے لگا۔

"سر' کافی" کبوتر خان کافی کا مگ لے کر آیا۔

"گڈ' ویری گڈ۔ میں پریشان تھا کہ میں پریشان کیوں ہوں؟ تمہیں دیکھ کر پتا چلا کہ میں کافی کے لئے پریشان تھا" مگ پکڑ کر میجر نے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبوتر خان کو پتا چلے کہ وہ پریشان کیوں ہے۔

"سر' آج آپ تھکے ہوئے لگتے ہیں" کبوتر خان بولا۔

"سپاہی کبھی نہیں تھکتا' اور اگر تھک گیا ہوں تو کافی پی کر پھر تمہاری طرح چاق چوبند ہو جاؤں گا"۔ کبوتر خان میجر کو خوش دیکھ کر خوش ہوا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

آدھی رات کو زبردست دھماکا ہوا۔ میجر بھاگ کر خیمے سے باہر آیا اور مورچے کی طرف چلا۔ اُس نے سوچا حملہ شروع ہو گیا ہے۔

"سر' دھماکا سُنا؟" کیپٹن توصیف پوچھ رہا تھا۔

"ہاں' سُنا۔ کچھ پتا چلا کہاں ہُوا؟" میجر نے پوچھا۔

"دشمن کے مورچوں کی طرف ہُوا ہے۔ میرا خیال ہے' روشنی کا گولا پھٹا ہے۔ لیکن روشنی نہیں ہوئی" کیپٹن بولا۔

"بس' تیار رہو" میجر نے کہا۔

رات بھر کچھ نہ ہُوا۔ اگر کچھ ہُوا تو یہ کہ برف گرتی رہی۔ دوسرے دن سویرے سویرے اکبر علی اور اُس کے ساتھی میجر کے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کے پاس مسعود کی لاش تھی' کمبل میں لپٹی ہوئی۔

"سر' رات مسعود نے دشمنوں کا بنایا ہُوا پُل اُڑا دیا اور خود بھی شہید ہو گیا" اکبر علی نے کہا۔

"آپ بچ گئے؟" میجر نے پوچھا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم بچ گئے" اکبر نے کہا اور مسعود کی لاش برف آلود پتھر پر رکھ دی۔ برف اب بھی گر رہی تھی۔ میجر طلحہ نے جُھک کر مسعود کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بولا "میں نے کہا تھا ناں کہ تم سچّے وطن دوست کشمیری ہو اور تم نے اِسے سچ کر دِکھایا"۔ برف اب بھی گر رہی تھی!

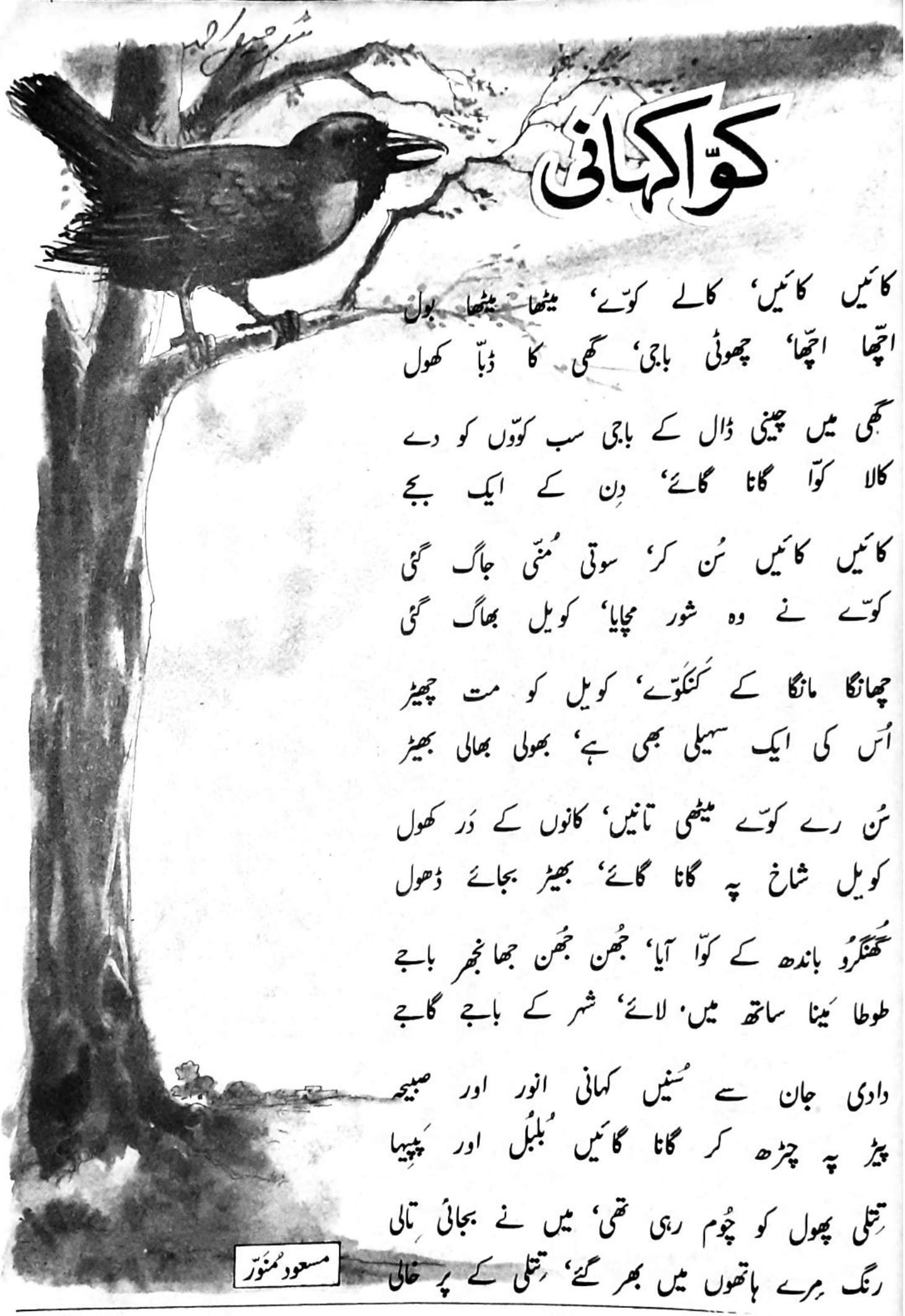

کوّا کہانی

کائیں کائیں، کالے کوّے، میٹھا میٹھا بول
اچھّا اچھّا، چھوٹی باجی، گھی کا ڈبّا کھول

گھی میں چینی ڈال کے باجی سب کوّوں کو دے
کالا کوّا گانا گائے، دِن کے ایک بجے

کائیں کائیں سُن کر، سوتی مُنّی جاگ گئی
کوّے نے وہ شور مچایا، کویل بھاگ گئی

چھانگا مانگا کے کَنکوّے، کویل کو مت چھیڑ
اُس کی ایک سہیلی بھی ہے، بھولی بھالی بھیڑ

سُن رے کوّے میٹھی تانیں، کانوں کے دَر کھول
کویل شاخ پہ گانا گائے، بھیڑ بجائے ڈھول

گھُنگرُو باندھ کے کوّا آیا، جُھن جُھن جھانجھر باجے
طوطا مَینا ساتھ میں لائے، شہر کے باجے گاجے

دادی جان سے سُنیں کہانی انور اور صبیحہ
پیڑ پہ چڑھ کر گانا گائیں بُلبُل اور پپیہا

تِتلی پھول کو چُوم رہی تھی، میں نے بجائی تالی
رنگ مِرے ہاتھوں میں بھر گئے، تِتلی کے پر خالی

مسعود مُنوّر

دلچسپ اور عجیب

○ جرمنی کے شہر برلن میں ایک جیل ہے، جس کی دیکھ بھال اور مُلازموں کی تنخواہوں پر حکومت کا تقریباً 80 لاکھ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ اِس جیل میں صِرف ایک قیدی ہے۔

○ جرمنی کے ایک بادشاہ، چارلس پنجم، کو 4 کا ہندسہ چمٹ گیا تھا۔ اُس نے چار شادیاں کیں۔ چاروں بیویوں سے چار چار بچّے ہوئے۔ اُس کی فوج میں چار ڈویژن تھے۔ مرتے وقت اُس کے سرہانے چار ڈاکٹر موجود تھے اور وہ 4 بج کر 4 مِنٹ پر فوت ہُوا۔

○ انگلینڈ کے ایک عِلاقے، لائی سسٹر شائر، کا ایک دولت مند پادری ڈاکوؤں سے بہُت ڈرتا تھا۔ اُس نے گھر کی حِفاظت کے لِئے خوف ناک کُتّے پال رکھے تھے، جنہیں وہ رات کو کھول دیتا تھا۔ اُسے اپنے نوکروں پر بھی بھروسا نہ تھا۔ رات کو وہ اُنہیں کمروں میں بند کر کے تالا لگا دیتا تھا۔

ایک دن، صبح کو، وہ نوکروں کے کمرے کھولنے جا رہا تھا کہ اُس کا ایک کُتّا اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ اُس سے بچنے کے لِئے بھاگا تو تالاب میں گر پڑا۔ تالاب گہرا تھا اور اُسے تیرنا نہ آتا تھا۔ اُس نے مدد کے لِئے نوکروں کو آواز دی۔ لیکن وہ تو کمروں میں بند تھے۔ بے چارہ پادری تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔

○ مشہور مُغل فاتح تیمُور لنگ (تیمُور لنگڑا) کو کھوپڑیوں کے مینار بنانے کا بہُت شوق تھا۔ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتا تو وہاں کے لوگوں کو قتل کر کے اُن کی کھوپڑیوں کا مینار بناتا۔ اُس نے (اِیران کا شہر) اِصفہان فتح کیا تو وہاں 70,000 کھوپڑیوں کا مینار بنایا۔ بغداد فتح کرنے کے بعد وہاں 90,000 کھوپڑیوں کا مینار بنایا۔ سب سے بڑا مینار اُس نے، 1398ء میں دہلی میں بنایا تھا۔ یہ دہلی کے ایک لاکھ لوگوں کی کھوپڑیوں کا تھا۔ یہ عظیم فاتح (تیمور لنگ) مشہور مُغول سردار چنگیز خان کی نسل سے تھا اور ہندوستان کے مُغل بادشاہ اِسی کی نسل کے تھے۔ اِس کا مقبرہ اُزبکستان کے شہر سمرقند میں ہے۔

○ ملائیشیا کے ایک شہر، سرم بان، کے ایک باشندے، کرِشنَن، کو ایک سانپ نے ڈس لیا۔ کرشنن غصّے میں آکر سانپ کو زندہ نگل گیا۔ جب اُس کے پیٹ میں درد ہُوا تو وہ ہسپتال گیا، جہاں اُس کا ایکس رے لیا گیا۔ سانپ اُس کے پیٹ میں تھا، لیکن مر گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اُس سے پوچھا کہ تم نے ایسی احمقانہ حرکت کیوں کی تو اُس نے کہا "میں سانپ کو سبق سکھانا چاہتا تھا"۔

○ جنوبی جاپان کے ایک جُونیئر اِسکول کا ایک ٹیچر اپنے شاگردوں کو عجب و غریب سزائیں دیتا تھا۔ ایک دفعہ اُس کے 30 شاگرد ٹیسٹ میں فیل ہو گئے تو اُس نے اُنہیں بجلی کے جھٹکے (الیکٹرک شاک) دِیئے۔ بچّوں نے اپنے ماں باپ کو بتایا اور ماں باپ نے اِسکول کے پرنسپل سے شِکایت کی۔ اُس نے ٹیچر کی چھُٹی کر دی۔

○ اِنڈونیشیا کے ایک جزیرے، سماٹرا، کے جنگل میں ایسے بونے رہتے ہیں، جن کا قد ایک ڈیڑھ سال کے بچّے کے برابر ہے۔ جن لوگوں نے اُنہیں دیکھا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اِن بونوں کے بدن پر بھُورے رنگ کے لمبے لمبے بال ہیں، اور وہ بہُت تیز دوڑتے ہیں۔ ایک شخص نے اِن بونوں کی فوٹو بھی اُتار لی تھی، جو اُس نے سائنس دانوں کو دکھائی۔ اب سائنس دانوں کی ایک ٹیم اُس جنگل میں پہنچ گئی ہے اور اِن بونوں کی بستی کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔

اِنکا کون تھے؟

اِن کا (Inca) ایک ریڈ اِنڈین قبیلہ تھا جو جنوبی امریکا کے پہاڑی سِلسِلے' اینڈیز' کے آس پاس آباد تھا۔ یہاں اِس قبیلے نے آج سے 800 سال پہلے ایک عظیمُ الشّان سلطنت قائم کی تھی' جس کا بادشاہ "مان کو کیپن" نام کا ایک شخص تھا۔ اپنے بادشاہ کے مُتعلّق اِنکا لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سورج دیوتا کی اولاد ہے۔

اِنکا ریڈ اِنڈینوں نے دھیرے دھیرے آس پاس کے تمام عِلاقے فتح کر لئے اور اُن کی سلطنت اُن علاقوں تک پہنچ گئی جن میں اب پیرو' بولیویا' ایکوا ڈور' چلی اور ارجنٹینا کے ملک آباد ہیں۔ یہ لوگ بہُت اچھّے کاشت کار تھے اور اپنے کھیتوں میں مکئی' لوبیا' ٹماٹر' سُرخ مرچیں' سیاہ مرچیں اور کپاس اُگاتے تھے۔ اُس وقت اِن چیزوں سے یورپ' ایشیا اور افریقہ کے لوگ ناواقف تھے (بعد میں یورپ کے لوگ اِن کے بیج یورپ لے گئے اور پھر وہاں سے یہ چیزیں ایشیا اور افریقہ میں آئیں)۔

اِنکا نے کھیتی باڑی کے عِلاوہ صنعت و حِرفت میں بھی خوب ترقّی کی تھی۔ اُن کے ملک میں لوہا نہیں تھا۔ البتّہ سونے کی بہُتات تھی۔ وہ زیورات کے عِلاوہ اپنے برتن اور اوزار بھی سونے کے بناتے تھے۔ ملک میں غریبی نام کو نہ تھی۔ ہر شخص خوش حال تھا۔ حکومت لوگوں سے کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہ لیتی تھی۔ البتّہ ہر جوان شخص کو کچھ عرصے کے لئے فوج میں کام کرنا پڑتا تھا' یا پھر اُنہیں سڑکیں بنانے' پُل تعمیر کرنے یا کانوں سے سونا وغیرہ نکالنے کے لئے بُلایا جاتا تھا۔ تمام بستیاں پُختہ سڑکوں کے ذریعے ملی ہوئی تھیں۔ دریاؤں پر پُل بنے ہوئے تھے اور آب پاشی کے لئے ملک بھر میں نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ دوا سازی اور جرّاحی (سرجری) میں بھی اِنکا نے کافی ترقّی کی تھی۔

اِنکا سلطنت میں بڑے بڑے قابِل اور اعلیٰ دماغ کے بادشاہ ہوئے۔ 1523ء میں اِن کا ایک بادشاہ مراتو ایک دھوکے باز شخص' اتا ہوالپا' نے ولی عہد کو قتل کر کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اِس سے ہر طرف افراتفری پھیل گئی اور لوگ آپس میں لڑنے لگے۔ اِسی دوران میں خبر آئی کہ گوروں کی ایک فوج' جس کا کمانڈر یورپ کے ایک مُلک اِسپین کا ایک شخص' فرانسسکو پزارو تھا' اِنکا کے دارالسّلطنت "کیوز کو" کی طرف بڑھ رہی ہے۔

پزارو کے ساتھ صِرف 108 سپاہی اور 62 گھوڑے تھے۔ اُس نے اتا ہوالپا کو قید کر لیا اور اُس سے کہا کہ وہ اپنے محل کا ہال کمرا سونے سے بھر دے تو اُسے رِہا کر دیا جائے گا۔ اتا ہوالپا نے پزارو کی بات مان لی اور ہال میں سونا بھر کے وہ سارا سونا پزارو کو دے دیا۔ لیکن پزارو نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور اتاہوالپا کو قتل کر کے اِنکا سلطنت کی اِینٹ سے اِینٹ بجا دی۔ اِس طرح ریڈ اِنڈینوں کی یہ شان دار سلطنت ختم ہو گئی۔ (س - ل)

دو مددگار

ڈاکٹر رضوان ثاقب

میں نے اپنے اُن دو مددگاروں کو کبھی نہیں جھٹلایا تھا اور مجھے پُختہ یقین تھا کہ مُصیبت کے وقت اُن سے بڑھ کر میرا کوئی اور مددگار نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کبھی کبھی دل میں یہ خیال کیوں آتا تھا کہ انہیں کبھی آزما کر دیکھنا چاہئے۔ کسی دوست کو بلاوجہ آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ کیوں کہ اگر وہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو دوستی کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ بس یہی ایک بات تھی جس کی وجہ سے میں اپنے ان دونوں دوستوں کو آزمانے کا ارادہ ترک کئے ہوئے تھا۔ لیکن قدرت کو شاید ان کی آزمائش منظور تھی۔ مجھ پر تو جو قیامت ٹوٹی سو ٹوٹی لیکن اس کے بعد مجھے یہ پتا ضرور چل گیا کہ یہ دونوں میرے بہت بڑے مددگار ہیں۔

میں موضع سیٹھ والا کے پرائمری اسکول میں ٹیچر ہوں' اور یہ واقعہ 1968ء کا ہے۔ اس وقت میری تنخواہ 84 روپے تھی۔ میرے تین بچے قمر' عاقل اور زبیر تھے۔ اتنی تھوڑی تنخواہ میں بچوں کی پرورش اور تعلیم کے اخراجات برداشت کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا' اس لئے میں نے سیٹھ والا سے اپنا تبادلہ اپنے گاؤں میں کروا لیا۔ کیوں کہ سیٹھ والا میرے گاؤں سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور میرے گاؤں سے اس طرف کوئی پکی سڑک نہیں جاتی۔ ایک کچا اور انتہائی خراب راستہ ہے۔ اس لئے پیدل چلنا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا تھا۔ بہرحال عام حالات میں گاؤں سے سیٹھ والا پہنچنے میں مجھے ایک گھنٹا لگ جاتا تھا۔ اب میرا ایک گھنٹا صبح کو اور ایک گھنٹا شام کو بچ جاتا تھا۔ اس لئے میں نے اسکول میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ کھیتی باڑی بھی شروع کر دی تھی۔

زبیر میرے تمام بچوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا اور میں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی طرف بہت توجہ دیتا تھا۔ ان دنوں گاؤں میں صرف ایک گھر میں بجلی تھی۔ یہ چودھری کا گھر تھا اور چودھری نے اپنا ذاتی ٹرانسفارمر لگایا ہوا تھا۔ زبیر دیے کی روشنی میں دیر تک پڑھتا تو اس کو بڑی کوفت ہوتی۔ اس لئے میں نے چودھری کی منت سماجت کر کے اس سے ایک بلب کا کنکشن مانگا۔ چودھری بھی علم کی قدر جانتا تھا اس لئے وہ راضی ہو گیا اور اب زبیر دیے کی بجائے بلب کی روشنی میں پڑھنے لگا تھا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جو بچہ جتنا ذہین ہوتا ہے اتنا

ہی شرارتی ہوتا ہے۔ یہ بات پتا نہیں کہاں تک سچ ہے۔ لیکن میں اگر زبیر کی شرارتوں کی طرف نظر دوڑاؤں تو مجھے یہ بالکل سچ معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ زبیر جتنا ذہین تھا' اتنا ہی شرارتی بھی تھا۔ قمر اور عاقل بھی شرارتی تھے مگر ان کی شرارتیں اتنی نہیں ہوتی تھیں' جتنی کہ زبیر کرتا تھا۔ مگر اس کی ان شرارتوں میں معصومیت ہوتی تھی اس لئے میں انہیں برداشت کرلیتا تھا۔

زبیر اب ساتویں سال میں تھا اور چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ لیکن مقابلہ وہ پانچویں جماعت کے بچوں کا کرتا تھا۔ پورے اسکول میں خوش خطی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ طالب علم تو طالب علم اس کی ہینڈ رائیٹنگ تو اس کے اساتذہ سے بھی اچھی تھی۔

یہ 7 جون 1968ء کا واقعہ ہے۔ عصر کا وقت تھا۔ گرمی کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی۔ میں نے نماز عصر ادا کی اور کسی کاندھے پر رکھ کر اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ میں سورج غروب ہونے سے پہلے سبزی کے بیج بونے کے لئے دو کیاریوں کے کنارے بنانا چاہتا تھا۔ مگر ابھی پہلا کنارہ بھی نہیں بنایا تھا کہ میرے کانوں نے ایسی آواز سنی کہ کسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ آواز سننے کے بعد مجھ میں چلنے کی ہمت نہ رہی تھی اور میں اپنا سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا تھا۔

گاؤں کی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر کوئی اعلان کر رہا تھا۔ "حضرات ایک اعلان سنیئے"۔ یہ آواز مولوی عزیز کی تھی۔ مولوی عبدالعزیز ہمارے گاؤں کی مسجد کے امام تھے۔ اور کسی کے فوت ہو جانے' جنازہ اٹھنے' کسی گھر میں آگ لگ جانے' گاؤں میں سؤروں کے گھس آنے اور نہر کے ٹوٹ جانے کا اعلان مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے کرتے تھے۔

چند لمحوں بعد مولوی صاحب کی آواز آئی "ماسٹر محمد خاں کا چھوٹا لڑکا زبیر"۔ انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ منگا مسیح بھاگتا ہوا آیا اور چیخ کر بولا "جتنی جلدی ممکن ہو سکے گھر پہنچو"۔ مگر میں کیسے بھاگتا۔ میری آنکھوں کے سامنے تو اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں مولوی عبدالعزیز کے منہ سے لفظ زبیر سننے کے بعد اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

"محمد خاں' حوصلہ رکھو حوصلہ۔ تمہارے بیٹے کو تو صرف چوٹیں آئی ہیں۔ لوگوں کے بیٹے تو اگلے جہاں چلے جاتے ہیں تو وہ حوصلہ نہیں ہارتے"۔ منگے مسیح نے میرے پاس آکر کہا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ میں کسی پکڑی اور دائیں ہاتھ سے مجھے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

"منگے' تجھے تیری کتاب مقدس کی قسم' سچ بتا زبیر زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"محمد خاں رب سے خیر مانگ خیر' ایسی باتیں منہ سے مت نکال۔ اسے جلدی سے شہر لے جا۔ زندہ تو ہے مگر اس کا خون اسی طرح بہتا رہا تو......."۔

"خاموش منگے' خاموش!" میں نے منگے کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی طرف چل پڑا۔ میرا گھر ہی نہیں بلکہ پوری گلی عورتوں' مردوں' بچوں اور بوڑھوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چھمو کا تانگہ میرے گھر کے دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا اور اس نے گھوڑے کی باگیں تھامی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی بے چینی سے میری راہ تک رہا تھا۔

گلی میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی مگر مجھے دیکھتے ہی لوگوں نے راستہ چھوڑنا شروع کر دیا۔ میں اب گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ گھر کے برآمدے میں چارپائی پر زبیر خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں شاید ضائع ہو گئی تھیں یا شاید خون کی وجہ سے مجھے ایسا لگ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے زبیر کو بازوؤں میں لیا اور تانگے میں بیٹھ گیا۔ "چل' چھمو۔ جلدی کر۔ شاید اللہ اسے زندگی دے دے" میں نے کہا۔ چھمو تو پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ میری بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ تانگہ چل پڑا تھا۔ میرے بچپن

کے دوست مقبول شاہ اور یوسف خاں ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور تانگہ اب شہر کی طرف دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

"زبیر! زبیر بیٹے"۔ میں اس کے کان پر منہ رکھ کر اسے پکار رہا تھا' مگر وہ "اوں' آں' ہائے" کے علاوہ کچھ نہیں کہہ پاتا تھا۔ لیکن اس کے یہ تین لفظ بھی مجھے مطمئن کر دیتے تھے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔

7 جون کو عصر کی نماز پڑھ کر جب میں اپنے کھیتوں کی طرف چلا تو زبیر' جو دوپہر سے بیٹھا پڑھ رہا تھا اسے کھیلنے کودنے اور شرارتیں کرنے کی چھٹی مل گئی تھی۔ "ٹھاہ" ایک زور دار دھماکا ہوا۔ زبیر یک دم کانپ گیا مگر پھر بینڈ باجے اور ڈھولک کی آواز سے اسے معلوم ہوگیا کہ یہ دھماکہ کوئی خطرناک بات نہیں بلکہ اس کے لئے خوشی کا پیغام ہے۔ کیوں کہ گاؤں میں بارات آئی تھی اور اب اسے شرارتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

صابر جوگی کی بیٹی کی شادی تھی۔ بارات بڑی دھوم دھام کے ساتھ آئی تھی۔ شادی بم' انار اور پٹاخے خوب چل رہے تھے۔ گاؤں کے ہر مکان کی دیواریں لرز لرز جاتی تھیں اور ہر بم کے چلنے پر دل سہم سہم جاتے تھے۔ گاؤں کے بچوں نے بارات کے اس جلوس کی رونق کو دوبالا کر رکھا تھا۔ کچھ بچے دولہا کے آگے **بھنگڑا** ڈال رہے تھے اور کچھ پیسے اٹھانے میں مصروف تھے۔ کچھ بموں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جونہی کوئی بم کے فیتے کو آگ لگاتا' بچے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے۔ زبیر بھی ان بچوں میں شامل تھا۔

مگر یہ کیا' زبیر کو اپنی انگلیاں ٹھونسے ہوئے پورے پانچ منٹ گزر چکے تھے مگر ابھی تک بم پھٹا نہیں تھا۔ حال آں کہ اس سے پہلے بم کے فیتے کو آگ لگنے کے بعد اسے پھٹنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ زبیر نے ڈرتے ڈرتے انگلیاں اپنے کانوں سے ہٹالی تھیں۔ "ٹھاہ!" ایک زور دار دھماکا ہوا اور زبیر ایک دم سہم گیا۔ اس نے بم کی طرف دیکھا مگر وہ اب بھی نہیں پھٹا تھا۔ یہ کوئی دوسرا بم تھا جس کو زبیر نے کھلے کانوں سن لیا تھا۔

زبیر اس پہلے والے بم کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ بم کو آگ تو لگی ہوئی ہے مگر آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے اور تھوڑا تھوڑا دھواں اٹھ رہا ہے۔ زبیر کو کیا معلوم تھا کہ یہ بم خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اس کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے لئے اسے ہاتھوں میں پکڑ لیا اور پھر اسے

غور سے دیکھنے لگا۔ ایک شرارتی لڑکے کا جب ادھر سے گزر ہوا تو اسے پتا نہیں کیا سوجھی کہ اس نے بم میں پھونک مار دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس پھونک سے آگ اچانک بھڑک اٹھی اور چند سیکنڈ کے بعد وہ کچھ ہو گیا جو زبیر کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ بم اس قدر زور سے پھٹا کہ زبیر کا چہرہ ہاتھ اور پیٹ بری طرح زخمی ہو گئے۔

بارات شور شرابے کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور زبیر دیواروں کا سہارا لے کر اپنے گھر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"امی گھورا لگا ہے۔ امی مجھے گھورا لگا ہے" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ماں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور وہ اسے دیکھے بغیر اپنے کام میں مصروف رہی۔ مگر زبیر نے جب کہا "امی مجھے بچاؤ' مجھے گھورا لگا ہے۔ میں مرجاؤں گا"۔ تو اس کی ماں نے پلٹ کر دیکھا۔اس کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔ زبیر دراصل گولہ کہنا چاہتا تھا مگر گولے کی بجائے اس کے منہ سے گھورا نکل رہا تھا۔

تانگہ اب ہسپتال پہنچ چکا تھا اور زبیر انتہائی نگہ داشت کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مقبول شاہ اور یوسف خاں مجھے دو دو سو روپے دے کر اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے واپس گاؤں چلے گئے تھے۔ میں اس کمرے کے باہر اکیلا کھڑا تھا۔ میری بیوی بھی تھوڑی دیر بعد بڑے بچے قمر کے ساتھ' ہسپتال پہنچ گئی تھی۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی انتہائی نگہ داشت کے کمرے کے باہر کھڑے تھے اور انتہائی پریشانی کے عالم میں زبیر کی زندگی کی خیر مانگ رہے تھے۔

پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ یہی تو وہ موقع ہے جب میں اپنے دو مددگاروں کو آزما سکتا ہوں۔ وہ ہماری اس پریشانی کو حل کر سکتے تھے۔ میں بے اختیار ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اب میں ہسپتال میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اچانک مجھے پانی کی ٹونٹی نظر آئی۔ میں اطمینان سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بسم اللہ پڑھ کر ہاتھ دھوئے' کلی کی' ناک صاف کی' چہرہ دھویا' کہنیوں تک بازوؤں کو دھویا۔ پھر سر کا مسح کر کے پیر دھوئے اور قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے پہلی رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ کی پہلی پندرہ آیات کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں اسی سورت کی اگلی تیس آیات تلاوت کیں۔ دو رکعت نماز ادا کر کے میں بڑے صبر اور ہمت کے ساتھ انتہائی نگہ داشت کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں سورۃ البقرہ کی وہ آیت جس کی میں نے سب سے آخر میں تلاوت کی تھی کا ورد کر رہا تھا۔ میرے دو مددگار پہنچ چکے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ واقعی اس آزمائش کی گھڑی میں میرا ساتھ دیتے ہیں۔

میں انتہائی نگہ داشت کے کمرے کے قریب پہنچا تو ایک دفعہ پھر میرے دل پر قیامت ٹوٹ پڑی مگر میں نے انتہائی صبر سے کام لیا۔ یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ بہت سارے لوگ دروازے کے قریب کھڑے رو رہے تھے۔ ان کے درمیان اسٹریچر پر شاید کسی کی لاش پڑی تھی۔ وہی سرخ چادر اس لاش کو ڈھانپے ہوئے تھی جو زبیر کے اوپر ڈال کر اسے اس کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ میں نے جب اپنی بیوی کو بھی آنسو بہاتے دیکھا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"اے اللہ مجھے یقین ہے کہ تو جو کرے گا بہتر کرے گا۔ مجھے میرے بیٹے کے متعلق اچھی خبر ملے یا بُری میں کوئی شکوہ زبان پر نہیں لاؤں گا اور تو مجھے ہر معاملے میں صابر پائے گا"۔ میں منہ ہی منہ میں بار بار یہ دعا مانگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلا۔ ہم دونوں میاں بیوی امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر میں نے ڈاکٹر کا چہرہ پڑھ لیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے ڈاکٹر کا چہرہ کہہ رہا ہو "محمد خاں' تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے دونوں مددگار تمہاری مدد کو پہنچ گئے ہیں"۔

"تمہارے بیٹے کی نہ صرف جان بچ گئی ہے۔ بلکہ اس کی نہ کوئی ہڈی ٹوٹی ہے اور نہ آنکھیں ضائع ہوئی ہیں"۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔

"یا اللہ' تیرا شکر ہے۔ واقعی یہ دونوں بہت بڑے مددگار ہیں۔ تو نے اپنی سچی کتاب میں بالکل سچ کہا ہے کہ جب بھی تم پریشانی کی حالت میں ہو تو ان دو مددگاروں کے ذریعے اللہ سے مدد مانگو۔ ہاں' واقعی' یہ دونوں مددگار یعنی صبر اور نماز بہت وفادار ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَ
اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

اور مدد طلب کرو تم صبر اور نماز کے ذریعے۔
یہ کام اگرچہ بہت مشکل ہے مگر (ان کے لئے کچھ
مشکل نہیں جو خدا سے) ڈرتے ہیں۔

(سورۃ البقرہ۔ آیت 45)

★★★★★★★★★★★

لوہا کھائیے

اگر آپ اپنے آپ کو تھکا تھکا سا محسوس کرتے ہیں' کسی کام میں دل نہیں لگتا یا بھوک اُڑ گئی ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ آپ کے جسم میں لوہے (آئرن) کی کمی ہے۔

لوہا ہماری صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ لڑکیوں اور جوان عورتوں کو تو خاص طور پر لوہے کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کی خوراک میں ایسی چیزیں شامل ہونی چاہئیں جن میں لوہا پایا جاتا ہے۔ اُنہیں روزانہ 14 ملی گرام لوہا اپنے جسم میں پہنچانا ضروری ہے۔ نوجوان مردوں کے لئے 12 ملی گرام کافی ہے۔

کسی ایسی چیز کا نام لینا بہت مشکل ہے جو ہمیں اِتنا لوہا مُہیّا کر سکے جو ہماری روز مرّہ ضرورت کے لئے کافی ہو۔ اِس لئے ہمیں اپنی خوراک میں ایسی چیزیں شامل کرنی چاہئیں جن میں تھوڑا بہت لوہا پایا جاتا ہے۔

لوہا حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بچھڑے اور بھیڑ بکری کا گوشت ہے۔ کلیجی میں بھی کافی لوہا ہوتا ہے۔ بے چھنے آٹے کی روٹی' خشک میوہ' لوبیا' مٹر اور ہرے پتّوں والی سبزیوں میں بھی کافی لوہا پایا جاتا ہے۔ لوہے کو اچھّی طرح ہضم کرنے اور اُسے بدن کا جزو بنانے کے لئے کھانے کے بعد ایسے پھل کھائیں جن میں وائٹامن C پایا جاتا ہے۔

جسم کو لوہا پہنچانے کا سستا طریقہ یہ ہے کہ لوہے کے برتن میں کھانا پکایا جائے۔ لوہے کے برتن میں آپ چاہے کچھ پکائیں' آپ کے جسم کو لوہا ملتا رہے گا۔

سرسیّد کی والدہ

زُبیدہ سُلطانہ

سرسیّد احمد خان ہندوستانی مسلمانوں کے بڑے مخلص راہ نُما تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔ کیوں کہ اُس وقت ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور سب دفتری کام انگریزی زبان میں ہوتے تھے۔ انگریزی جاننے والے ہندوؤں نے ہر محکمے میں عُہدے سنبھال رکھے تھے اور مسلمان اِس زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہر جگہ پیچھے رہ گئے تھے۔ سرسیّد کی سر توڑ کوششوں سے آخر کار مسلمانوں نے بھی اِس ضرورت کو محسوس کیا اور اپنے بچّوں کو اِسکولوں اور کالجوں میں داخل کرانے لگے۔

سرسیّد عورتوں کی تعلیم کے بھی زبردست حامی تھے۔ پچھلی صدی کے آخر میں ہندوستان میں ایک تعلیمی کمیشن قائم کیا گیا۔ سرسیّد بھی اُس کے رُکن تھے۔ اِس کمیشن کے ایک اِجلاس میں اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ عورتوں کے لئے بھی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں، تو اِس پر اُنہوں نے عورتوں کی تعلیم کی پُر زور حمایت کی اور بڑے فخر سے بتایا کہ اُن کی والِدہ عزیزُ النِّسا بیگم پڑھی لکھی خاتون ہیں اور میں نے اِبتدائی تعلیم خود اپنی والِدہ سے حاصل کی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ ماں کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اُنہیں زندگی میں اِتنا بڑا مقام حاصل ہوا۔

سرسیّد احمد کی والِدہ عزیزُ النِّسا بیگم نوّاب فریدُ الدّین احمد کی سب سے بڑی صاحِب زادی تھیں۔ نوّاب صاحِب کو شاہی درباروں سے بڑے بڑے خطاب اور عُہدے ملے تھے۔ وہ پنجاب کے مہاراجا رنجیت سِنگھ کے بھی وزیر رہ چکے تھے۔ مگر اِستعفا دے کر وطن چلے گئے تھے۔

تھوڑے عرصے بعد رنجیت سِنگھ کو اپنے اِس عقل مند وزیر کی کمی محسوس ہوئی تو اُس نے اپنا ایک درباری اُن کے پاس بھیجا، جس نے 30 ہزار کی رقم سفرِ خرچ کے لئے پیش کی اور واپس لاہور چلنے کی درخواست کی۔ اِس پر نوّاب صاحِب کے سب خاندان والے خوش ہو گئے مگر عزیزُ النِّسا بیگم نے مُخالفت کی۔ وہ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا "آپ کی صِحّت اِس بات کی اِجازت نہیں دیتی کہ اِس عُمر میں دُور دراز کا سفر اِختیار کریں اور وزارت کے عُہدے کی ذِمّے داریاں سنبھالیں۔ اِس عُمر میں آپ کو آرام اور سُکون کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس اللہ کا دِیا سب کچھ ہے۔ اپنی زندگی بے فِکری سے گزاریں"۔

نوّاب صاحِب نے بیٹی کی بات مان لی۔ اُنہوں نے سفرِ خرچ کی رقم واپس کر دی اور لاہور جانے سے اِنکار کر دیا۔

سرسیّد احمد خان بتاتے تھے کہ والِدہ بچّوں کو پڑھانے بیٹھتیں تو ایک چھڑی ضرور پاس رکھ لیتیں۔ لیکن یہ صِرف ڈرانے کے لِئے ہوتی' مارتی کبھی نہیں تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں اِس طریقے سے نصیحت کرتیں اور چھوٹی چھوٹی اَخلاقی اور دینی باتیں سمجھاتیں کہ وہ بچّوں کے دِل پر نقش ہو جاتیں۔

وہ گھر کے مُلازموں کے ساتھ خود بھی عزّت سے پیش آتیں اور بچّوں کو بھی ہمیشہ یہی تاکید کرتیں۔ بچپن میں سرسیّد نے ایک دفعہ گھر کے ایک پُرانے مُلازِم کے تھپّڑ مار دیا۔ اِس پر والِدہ نے خفا ہو کر اُنہیں گھر سے نکال دیا۔ قریب ہی اُن کی خالہ کا گھر تھا۔ وہ ڈر کے مارے تین چار دن خالہ کے گھر چھُپے رہے۔ آخر خالہ نے اُنہیں اِس شرط پر مُعافی دِلوائی کہ پہلے وہ مُلازِم سے مُعافی مانگیں۔ چُناں چہ اُنہوں نے مُلازِم سے مُعافی مانگی تو پھر کہیں والِدہ نے اُنہیں مُعاف کیا۔

ایک دفعہ سرسیّد اپنے کسی مُخالِف کے خِلاف کوئی قانونی کارروائی کرنے کا اِرادہ کر رہے تھے۔ اُس شخص نے اُنہیں بہُت نقصان پہنچایا تھا۔ حال آں کہ کبھی پہلے سرسیّد نے اُس پر ایک بہُت بڑا احسان بھی کیا تھا۔ مگر اُس نے وہ اِحسان بھُلا دیا اور اپنے مُحسِن کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آیا۔ جب عزیزُ النّسا بیگم کو اِس بات کی خبر ہوئی تو اُنہوں نے بیٹے سے کہا:

"تم اپنے مُعاملے کو اُس بڑی عدالت کے سپُرد کیوں نہیں کر دیتے جو قصور وار کو پوری پوری سزا دیتی ہے۔ تم تو اپنے مُجرِم کو معمولی سزا پانے کا موقع دے رہے ہو"۔

یہ بات خدا رسیدہ ماں نے کچھ اِس لہجے میں کہی کہ سرسیّد کے دل پر اثر ہُوا اور اُنہوں نے نہ صِرف اپنے اور اُس شخص کے مُعاملے کو خدا کے اِنصاف پر چھوڑ دیا بلکہ اِس کے بعد اُنہوں نے کبھی کسی سے اِنتقام نہیں لیا۔ وہ ہر کسی کی زیادتی کو خدا کے سپُرد کر دیتے۔

عزیزُ النّسا بیگم نے اپنی حویلی کا ایک حِصّہ غریب اور لاوارث عورتوں کے لِئے وقف کر رکھا تھا۔ وہ خود اُن کا خرچ اُٹھاتیں اور دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ اِس قدر رحم دل اور خدا ترس تھیں کہ ایک دفعہ گھر کی خادِمہ اور وہ خود ایک ہی وقت بیمار ہو گئیں۔ وہ نہ صرف خادِمہ کو بھی وُہی دوا دیتیں جو حکیم نے اُنہیں دی تھی بلکہ تن دُرست ہونے کے بعد جو قیمتی معجُون طاقت کے لِئے حکیم نے اُنہیں دی تھی' وہ ساری کی ساری اُس خادِمہ کو کِھلا دی' کیوں کہ وہ بھی بوڑھی اور کم زور تھی اور اُسے بھی وہی تکلیف تھی جو سرسیّد کی والِدہ کو تھی۔ سرسیّد نے ایک دن والِدہ کی اچھّی صِحّت دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا:

"حکیم صاحِب کی معجُون نے آپ کی صِحّت پر اچھا اثر کیا ہے"۔

اِس پر وہ ہنس کر بولیں "اللہ شِفا بخشنے والا ہے"۔

یہ ایک واقِعہ اِن نیک دل خاتون کی حوصلہ مندی اور دریا دلی کا بہُت بڑا ثبوت ہے۔ اُن کا چھوٹا بیٹا سیّد محمّد خان ابھی جوان ہی تھا کہ اچانک بیمار ہُوا اور فوت ہو گیا۔ اُنہی دِنوں عزیزوں میں کسی کی بیٹی کی شادی تھی جو اُنہوں نے سیّد محمّد خان کی موت کی وجہ سے مُلتوِی کر دی۔ حال آں کہ لوگوں کو دعوت نامے جا چکے تھے۔ بیٹے کے سوم کے بعد عزیزُ النّسا بیگم خود اپنے اُس عزیز کے گھر گئیں اور کہا:

"یہ تو اللہ کی رِضا تھی جو پوری ہو چکی۔ اب آپ بِسمِ اللہ کر کے بیٹی کا فرض ادا کریں۔ شادی مُلتوِی کرنے کی صورت میں بہُت سے لوگوں کو پریشانی اُٹھانا پڑے گی۔ میں آپ کو اِجازت دیتی ہوں کہ آپ بچّی کو رُخصت کریں"۔

جب اِن نیک بی بی کا اِنتقال ہوا تو اِن کی صرف بیماری کے چند دنوں کی نمازیں اِن کے ذِمّے قضا واجِب تھیں' جن کے بارے میں اُنہوں نے سرسیّد کو وصیّت کی کہ پڑھ کر بخش دی جائیں۔ ان کے سعادت مند بیٹے سرسیّد احمد خان نے ماں کی یہ وصیّت پوری کی۔

آیئے مُسکرائیں

ایک مزدُور تنخواہ کا لِفافہ لے کر خزانچی کے پاس آیا اور بولا "جناب' اِس میں پانچ روپے کم ہیں"۔

خزانچی نے کہا' "پچھلے مہینے جب تمہارے لفافے میں پانچ روپے زیادہ چلے گئے تھے' تب تم میرے پاس کیوں نہیں آئے تھے؟"

مزدور بولا "تب آپ نے پہلی بار غَلَطی کی تھی' جسے میں نے برداشت کر لیا تھا مگر دوسری بار آپ کی غلَطی برداشت نہیں کر سکتا"۔ (رانا محمّد شاہِد' گُلستان کالونی بورے والا)

جنازے کے ساتھ دو بہُت بوڑھے آدمی قبرستان پہنچے۔ ایک بوڑھے نے دوسرے بوڑھے سے پُوچھا "آپ کی عُمر کیا ہو گی؟"

دوسرے بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ یہی کوئی 98 برس۔ اور آپ کی؟"

پہلا بُوڑھا بولا "99 برس"۔

دوسرے بوڑھے نے کچھ سوچا اور پھر بولا "کیا خیال ہے' گھر واپس جائیں یا نہیں؟" (محمّد حامِد رانا' کاموں کی)

ایک آدمی کے گھر چوری ہو گئی۔ پولیس نے اُس سے پُوچھا "جب چور تمہارے گھر میں داخل ہُوئے تو کیا بجا تھا؟"

آدمی بولا "ایک ڈنڈا میرے سر پر بجا تھا اور دوسرا میری بیوی کے سر پر"۔ (قُرۃُ العین' مظفّر گڑھ)۔

دو آدمی اپنے کُتّوں کے بارے میں گُفت گُو کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے کہا "میرا کتّا بہُت ذہین ہے۔ جب وہ باہر گھوم پھر کر گھر واپس آتا ہے تو گھنٹی بجا دیتا ہے"۔

دوسرا آدمی حیران ہو کر بولا "کمال ہے! تمہارے کُتّے کے پاس' میرے کتّے کی طرح' دروازے کی چابی نہیں ہوتی؟" (اِرم بتول' واپڈا کالونی چشمہ بیراج)

نماز کے بعد لوگ مسجد سے نکل کر جُوتے پہن رہے تھے کہ ایک صاحِب نے ڈرتے ڈرتے دوسرے صاحِب سے پوچھا "مُعاف کیجئے گا' آپ کا نام صادِق علی تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ میرا نام اشرف خان ہے" دوسرے صاحِب نے جواب دیا۔

پہلے صاحِب بولے "لیکن آپ صادِق علی کا جُوتا پہن رہے ہیں' اور اِتّفاق سے میرا نام صادِق علی ہے"۔ (میر عدیل پرویز' مظفّر آباد)

عُثمان نے اپنے دوست اکمل کو بتایا کہ میرا بھائی دن میں چار پانچ دفعہ کپڑے بدلتا ہے۔

اکمل نے کہا "کیا وہ بہُت امیر آدمی ہے؟"

عُثمان بولا "نہیں۔ وہ تو ابھی صِرف چار پانچ ماہ کا ہے"۔ (ظِلِّ ہُما راجپوت' گگو منڈی تحصیل بورے والا)

ایک عورت نے اپنی سہیلی سے پُوچھا "بہُت عرصے سے تمہارے شوہر نظر نہیں آ رہے۔ کیا بات ہے؟ کیا کچھ بیمار ہیں؟"

سہیلی بولی "کچھ عرصہ پہلے وہ بیمار تھے۔ میں اُنہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اُس نے اُنہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جب تک میں نہ کہوں' بستر سے نہ اُٹھنا۔ اِس کے بعد ڈاکٹر کا اِنتقال ہو گیا"۔ (اِرم بتول' چشمہ بیراج)

باتیں بڑوں کی

مرسلہ : محمّد نوید اِکرام، میانوالی

○ رات کا کھانا ضرور کھایا کرو، کیوں کہ رات کا کھانا ترک کرنے سے بُڑھاپا جلد آتا ہے۔ (نبیِ کریم صلّی اللہ عَلَیہِ وَسلّم)

○ عِلم مال سے بہتر ہے، کیوں کہ عِلم تمہاری حفاظت کرتا ہے، اور مال کی تم حفاظت کرتے ہو۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ : تنویر احمد، رحیم آباد راولپنڈی

○ دُشمن کو مُعاف کر دینا اُس پر فتح حاصل کرنا ہے۔

○ اگر تم نیچے والوں پر ظلم کر رہے ہو تو اُوپر والے کے اِنتقام کا اِنتظار کرو۔

مرسلہ : راجا اِمتیاز حُسین، حامد ٹاؤن راولپنڈی۔

○ ایک آدمی کی بدقسمتی، دوسرے آدمی کی خوش قسمتی کا سبب بنتی ہے۔ (فرانسِس بیکن)

○ بے کار مت بیٹھو۔ اِس سے زندگی کی مُشکلات بڑھتی ہیں۔ (گوئٹے)

مرسلہ : صائمہ کنول، سہوانی کراچی

○ دل کا سکون چاہتے ہو تو حسد سے دُور رہو۔ (بابا فرید گنج شکرؒ)

مرسلہ : عُظمیٰ نعیم، رُکن رشی

○ دوستی کے بندھن کو مضبوط بنانا ہے تو دوسروں سے ملتے رہو۔ اگر بہت ہی مضبوط بنانا ہے تو کبھی کبھار مِلو۔ (مارک ٹوئن)

مرسلہ : محمّد اِمتنان چاہل، فیصل آباد

○ نا اُمید ہونے سے عُمر کم ہوتی ہے۔ (ارسطو)

○ میٹھی زبان بے شمار دشمنوں سے بچاتی ہے۔ (شیخ سعدیؒ)

○ عقل مند پہلے دماغ سے پوچھتا ہے، پھر بولتا ہے۔ (حضرت عبدالقادر جیلانیؒ)

مرسلہ : کریم خان عادل، سلنی ٹوپی

○ سچّا دوست وہ ہے جو تمہاری طرف اُس وقت آئے جب ساری دُنیا تمہارا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔ (وچل)

مرسلہ : اَسارا خلیل احمد خان، ساہیوال

○ تین چیزوں کا اِحترام کرو : اُستاد، والِدین اور قانون۔ (شیکسپیئر)

مرسلہ : محمّد عُمر خان، شور کوٹ چھاؤنی

○ خدا اور موت کو کبھی نہ بھول۔ اپنی نیکی اور دوسروں کی بدی کو بھول جا۔ (حکیم لُقمان)

مرسلہ : وقار علی، بستی سلطان جھنگ صدر

○ جس قدر اپنی ضرورتوں کو کم کرو گے، اُسی قدر راحت پاؤ گے۔ (حضرت اویس قرنیؒ)

○ وہ شخص عقل مند ہے جو غصّے کی حالت میں بھی بُری بات مُنہ سے نہیں نکالتا۔ (شیخ سعدیؒ)

○ یا اللہ! میں زیادہ سونے والی آنکھ اور زیادہ بھرنے والے پیٹ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (اویس قرنیؒ)

○ زیادہ خوش حالی اور زیادہ بدحالی بُرائی کی طرف لے جاتی ہے۔ (بُو علی سینا)

مرسلہ : محمّد اِمتنان چاہل، غلام محمد آباد

○ دوسروں پر کیچڑ مت اُچھالو۔ اِس سے دوسرے گندے ہوں، نہ ہوں، تمہارے ہاتھ ضرور گندے ہو جائیں گے۔

مرسلہ : محمّد یُوسُف، محمّدیہ کالونی سرگودھا

○ دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سُنے۔ (اُقلیدس)

○ بولنے میں نرمی اختیار کرو۔ لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔ (حضرت لقمان)

مرسلہ : غیاث ارسلان، جھنگ صدر

○ لوگوں کے دل میں گھر کرنا چاہتے ہو تو مسکراؤ (ڈیل کارنیگی)

آپ بھی لکھیے

مُرغ کا قورمہ

محمد شاہد حفیظ فانی، اللہ آباد میلسی

"راحیل، راحیل، بیٹے۔ کہاں جا رہے ہو؟" امّی نے راحیل کو آواز دے کر پوچھا۔

"بازار جا رہا ہوں، نئے سال کا کیلنڈر لینے" راحیل نے جواب دیا۔

"اچھا، لے آؤ۔ لیکن جان داروں کی تصویروں والا کیلنڈر مت لانا۔ جس گھر میں تصویریں ہوتی ہیں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے" امّی نے کہا۔

"بہت اچھا، امّی۔ ایسا ہی کروں گا" راحیل نے جواب دیا۔

گھر کا کام کاج کر کے راحیل کی امّی تھک چکی تھیں۔ وہ پلنگ پر لیٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اُنھوں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ یہ عورت راحیل کے گھر کے ساتھ ایک کچّے گھر میں رہتی تھی اور بہت غریب تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا۔

راحیل کی امّی کو دیکھتے ہی اُس نے سلام کیا۔

امّی نے سخت لہجے میں کہا "کیا بات ہے؟"

"جی، وہ میرے......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

"جلدی بتاؤ۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے" راحیل کی امّی نے اُسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"جی..... میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میرے بچّے کل سے بھوکے ہیں۔ آپ کچھ..... سالن اور...... روٹی دے دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"کیسا سالن؟" امّی نے نفرت اور غصّے سے کہا "میں تمھارے لیے سالن لیے بیٹھی ہوں؟ تم کو مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" یہ کہ کر اُنھوں نے دروازہ بند کیا اور کمرے میں چلی گئیں۔

اُس غریب کے دل پر چوٹ لگی۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آہ! غریبی۔ اِس کی وجہ سے اُسے کیا کچھ سُننا پڑا۔

راحیل کی بہن عائشہ یہ ساری باتیں کمرے میں بیٹھی سُن رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ ہانڈی سے سالن نکال کر اُس بے چاری کو دے دے، لیکن وہ امّی کے آگے مجبور تھی۔

امّی نے اندر آ کر عائشہ سے کہا "دیکھا تم نے؟ سالن لینے آئی تھی۔ اِن لوگوں کو مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ باسی سالن ہوتا تو دے دیتی۔ تازہ سالن اور وہ بھی مُرغ کا قورمہ، بھلا کیسے دیتی۔ شام کو تمھارے ماموں کو بھی آنا ہے اور مرغ کا قورمہ اُنھیں بہت پسند ہے"۔

عائشہ ماں کی یہ باتیں سُن کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "امّی، آپ نے اُس غریب کو جھڑک کر اُس کے دل کو ٹھیس

لگائی ہے' اور خدا کو الگ ناراض کیا ہے"۔

"اچھا' اب تم مجھے سمجھانے لگی ہو؟ یہ زمانہ بھی آنا تھا کہ بیٹیاں ماؤں کو سمجھائیں۔ تمہارے ابّو سارے محلّے کے لئے نہیں کماتے" امّی غصّے سے کہنے لگیں۔

عائشہ یہ سُن کر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اِتنے میں راحیل بازار سے آگیا۔ اُس نے کہا "دیکھئے امّی' کتنا خوب صورت کیلنڈر ہے۔ اِس پر احادیث لکھی ہوئی ہیں"۔

امّی نے حدیثیں پڑھنا شروع کیں: رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا' "وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اُس کا پڑوسی بھوکا رہے"۔

اِس حدیث نے راحیل کی امّی پر بہت اثر کیا اور وہ شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ "اُف! میرے خدا۔ میں کتنی گناہ گار ہوں۔ میں نے کتنا بُرا کام کیا۔ میری پڑوسن فاقے کرے اور میں مُرغ اُڑاؤں"۔ اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

انہوں نے آنسو پونچھ کر عائشہ کو آواز دی اور جب وہ آئی تو اُس سے کہا "عائشہ' بیٹی۔ تم سچ کہہ رہی تھیں۔ واقعی میں نے پڑوسن کا دل دُکھایا۔ تم جلدی سے اُسے سالن اور کچھ روٹیاں دے آؤ"۔

عائشہ خوشی سے کِھل اُٹھی اور اُس عورت کو کھانا دینے چلی گئی۔

(پہلا اِنعام: 50 روپے کی کتابیں)۔

وطن کی خاطر

محمد سلیم اعوان' پوٹہ ضلع ڈیرہ اِسماعیل خان

دروازے پر دستک ہوئی تو رحیم بابا کھانستے ہوئے چارپائی سے اُٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ باہر اُن کا اِکلوتا بیٹا ماجد کھڑا تھا۔ وہ اندر آگیا۔ اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور مغرب کی طرف سُرخی چھائی ہوئی تھی۔

رحیم بابا کراچی کے پاس ایک گاؤں میں اپنے بیٹے اور بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ پولیس کی مُلازمت سے ریٹائر ہوئے تھے اور کوئی ایک ہفتہ پہلے اُنہوں نے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔ بیٹی کی شادی سے پہلے اُن کی گزر بسر اچھی ہو رہی تھی اور گھر کا خرچہ اُن کی پینشن سے چل رہا تھا۔ لیکن بیٹی کی شادی پر اُن کی پینشن کی ساری رقم خرچ ہو گئی اور اب بڑی مشکل سے گزارہ ہو رہا تھا۔

ماجد نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ رحیم بابا کی ریٹائرمنٹ کی وجہ سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا تھا۔ بس سارا دن آوارہ گردی کرتا پھرتا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ گھوم پھر کر گھر لوٹا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد رحیم بابا نے اُس سے کہا "بیٹے' گھر کا خرچہ مشکل سے چل رہا ہے۔ اِس لئے تم فضول پھرنے کے بجائے کوئی کام ڈھونڈو"۔

ماجد نے جواب دیا "ابّو' میرا ایک دوست ہے' قاسم۔ اُس کے والد کی پلاسٹک کی فیکٹری ہے۔ اُس نے مجھے فیکٹری میں کام کرنے کے لئے کہا ہے اور میں کل سے وہاں جاؤں گا"۔

"بیٹے' آج کل شہر کے حالات بہت خراب ہیں۔ اِحتیاط سے جانا" رحیم بابا نے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' ابّو۔ ویسے بھی فیکٹری ہنگاموں والی جگہوں سے کافی دور ہے۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے" ماجد نے اپنے ابّو کو مُطمئن کرتے ہوئے کہا۔

ماجد کو کام پر جاتے ہوئے آج تیسرا روز تھا۔ اُس نے رحیم بابا سے کہا تھا کہ فیکٹری میں ماہوار تنخواہ کی بجائے روزانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ اُس نے تیسرے دن ایک ہزار روپے رحیم بابا کے ہاتھ پر رکھے تو وہ حیران رہ گئے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ تمہیں ایک دن کی اِتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے؟ لیکن ماجد ٹال گیا۔ رحیم بابا کے دل میں شک پیدا ہوا کہ ماجد کہیں بُرے لوگوں کے ساتھ تو نہیں رل گیا۔

ایک روز ماجد صبح سویرے کام پر چلا گیا۔ اُس کی ماں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی اور رحیم بابا پُرانی

کتابوں میں سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ماجد کے کام کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے۔ ابھی 10 بجے ہوں گے کہ ماجد لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا اور چارپائی پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اُس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اُس سے خون نکل رہا تھا۔ رحیم بابا نے زخم پر پٹّی باندھ دی تاکہ زیادہ خون نہ بہے۔ پٹّی باندھنے کے بعد رحیم بابا نے اپنی بیوی سے کہا "تم اِس کا خیال رکھو۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں"۔ لیکن ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ زور سے دستک ہوئی۔ اُنہوں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ باہر دو سپاہی اور ایک اِنسپکٹر کھڑا تھا۔ وہ اُنہیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

انسپکٹر نے رحیم بابا سے کہا "جناب' ہم ایک دہشت گرد کو تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی آدھ گھنٹا پہلے چند دہشت گردوں نے ایک مارکیٹ میں اندھا دُھند فائرنگ کی تھی جس سے کئی آدمی ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔ ہماری گشتی ٹیم اُدھر سے گزر رہی تھی۔ دہشت گردوں نے ہمیں دیکھا تو فرار ہو گئے۔ اُن میں سے ایک دہشت گرد اِس گلی میں داخل ہُوا تھا۔ اگر آپ کے گھر میں آیا ہو تو ہمیں بتائیں۔ اُس کی ایک ٹانگ میں گولی لگی ہے"۔

رحیم بابا نے اِنسپکٹر کی یہ باتیں سُنیں تو گرتے گرتے بچے۔ انہیں زمین آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ آخر اُن کا شک دُرست ہی نکلا۔ اُن کا اپنا بیٹا لوگوں کو قتل کرتا پھر رہا تھا اور وہ اُس کو حلال روزی سمجھ رہے تھے۔ اُنہوں نے خود تو لوگوں کی حفاظت کا پیشہ اپنایا تھا اور اُن کا بیٹا لوگوں کی جانیں لے رہا تھا۔ اب ایک طرف بیٹے کی محبّت تھی اور دوسری طرف وطن کی سلامتی۔ کچھ دیر اِن دونوں میں کش مکش ہوتی رہی۔ آخر بیٹے کے پیار پر وطن کی مُحبّت غالب آگئی۔

اُنہوں نے اِنسپکٹر سے کہا "جناب' میرے گھر میں ایک دہشت گرد چُھپا ہوا ہے۔ اُسے گرفتار کر لیجئے"۔

اِنسپکٹر نے اندر داخل ہو کر ماجد کو' جو اب ہوش میں آ چکا تھا اور درد سے کراہ رہا تھا' گرفتار کر لیا۔ ہمارے پیارے ملک پاکستان کو رحیم بابا جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ تب ہی یہ ملک امن و امان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ (دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)۔

خلش

محمّد عمران خان' گُل بہار پشاور

یہ کہانی بالکل سچّی ہے اور میرے والِد نے مجھے سُنائی تھی۔ میرے والِد ٹیچر تھے۔ اُن کی تنخواہ بہت کم تھی' اِس لئے گھر کے اِخراجات پورے کرنے کے لئے وہ اپنے فالتو وقت میں بچّوں کو معمولی ٹیوشن پر پڑھاتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس سے اُن کی چھوٹی موٹی ضروریات بھی پوری ہوتی رہتی ہیں اور خدمتِ خلق کا سِلسِلہ بھی جاری رہتا ہے۔

ایک دن اُنہیں ایک مُختصر سا خط ملا۔ اُس میں صرف چند جُملے لکھے ہوئے تھے۔ لکھنے والے نے لکھا تھا کہ وہ 20 سال پہلے اُن کا شاگرد تھا۔ اب کسی اور شہر میں مُقیم ہے اور اُن سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ خط کے آخر میں جو پتا لکھا تھا' والِد صاحِب نے اُسے اُس پتے پر جواب دے دیا۔

چند روز بعد کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ والد صاحِب خود ہی اُٹھ کر دروازہ کھولنے چلے گئے۔ دروازہ کھولا تو اُنہوں نے دیکھا کہ ایک لمبی چمکیلی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر 40 سال کا ایک آدمی نفیس سُوٹ پہنے بیٹھا ہُوا ہے۔ گاڑی کا ڈرائیور گاڑی کے باہر کھڑا تھا۔ گھنٹی بھی اُسی نے بجائی تھی۔ والِد صاحِب کو دیکھتے ہی وہ شخص باہر نکلا اور اپنا تعارُف کراتے ہوئے کہا "میرا نام علی ہے اور میں 20 سال پہلے آپ کا شاگرد تھا۔ کیا میں آپ کے چند مِنٹ لے سکتا ہوں؟" والد صاحب نے مسکراتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھاما اور بیٹھک میں لے آئے۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر والد صاحب بولے "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اُس نے بڑے ادب سے کہا "میں مُعافی چاہتا ہوں کہ آپ کے آرام میں خلل ڈالا۔ دراصل بات یہ ہے کہ...." یہ کہہ کر

وہ چُپ ہو گیا اور زمین کو گھورنے لگا۔

والدِ صاحب نے اُس کی ہمّت بڑھاتے ہوئے کہا "کہو۔ میں سُن رہا ہوں"۔

اِس پر اُس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا "25 سال پہلے میں شام کی کلاس میں آپ سے پڑھا کرتا تھا۔ اُس کلاس میں 30 کے قریب لڑکے تھے اور آپ اُن سے 20 روپے فیس لے کر اُنہیں تین چار گھنٹے پڑھایا کرتے تھے۔ میں چار مہینے آپ سے پڑھتا رہا اور اِمتیازی نمبروں سے پاس ہو گیا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ میں آپ کو ٹیوشن فیس نہیں دیتا تھا۔ آپ نے بھی کبھی مُطالبہ نہیں کیا کہ فیس ادا کرو اور میں آپ کو جُل دے کر بغیر پیسوں کے پڑھتا رہا"۔

والدِ صاحب مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور بڑی دلچسپی سے اُس کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر وہ شخص بولا "پھر یُوں ہُوا کہ میں نے اپنی تعلیم مکمّل کی، مقابلے کے اِمتحان میں بیٹھا، اِمتیازی نمبروں سے پاس ہوا اور اب میں حکومتِ پاکستان کا ایک بڑا افسر ہوں۔ لیکن طالبِ علمی کے زمانے کی بد دیانتی جو آپ کے حق میں مجھ سے ہوئی تھی، کانٹے کی طرح سارا عرصہ میرے دل میں چُبھتی رہی۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی مُلازمت کا سارا زمانہ صِرف اِس ایک خلِش کی وجہ سے اِنتہائی اِیمان داری سے گزارا، کیوں کہ میں کوئی بے ایمانی کر کے کوئی اور خلِش دل میں پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اِس ذہنی خلِش کو ختم کرنے کے لئے ایک انوکھا طریقہ اِختیار کیا۔ ہمارے علاقے میں ایک مسجد بن رہی تھی۔ میں نے اُس کی تعمیر میں آپ کی طرف سے ایک اچھّا خاصا چندہ دے کر اِس خلِش کو مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اِتّفاق سے پچھلے ماہ مجھے ایک دوست سے ملنے کا موقع ملا۔ باتوں باتوں میں آپ کا ذکر بھی آگیا۔ وہ خوش قسمتی سے آپ کا پتا جانتا تھا۔ اُس سے پتا لے کر میں نے آپ کو خط لکھا۔ اب میں آپ سے مُعافی مانگنے آیا ہوں"۔

یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ والدِ صاحب نے اُٹھ کر بڑی شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "تم جیسے شاگرد ہی میرا اصلی سرمایہ ہیں۔ کاش! ہر افسر تم جیسا ہو"۔ وہ شخص اُٹھا اور میرے والد صاحب کے ہاتھ کو بوسہ دے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آنسوؤں کا سیلاب اُس کے لئے ضبط کرنا مشکل ہو رہا ہو۔ والدِ صاحب جب اُس کو رُخصت کر رہے تھے تو اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنا بوجھ پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہو۔ اُس نے جھک کر میرے والدِ صاحب کو سلام کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

(تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں۔ محمد عمران خان اپنا پورا پتا لکھ کر بھیجیں)۔

عرشی

مائرہ احمد علی، ناصر کالونی کراچی

"ہُونہہ! کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو یہ اسد کا بچّہ۔ اِس کا خیال ہے کہ اِس طرح یہ سب کی نظروں میں اُونچا ہو جائے گا" عرشی اپنے آپ سے باتیں کرتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسد سے کسی طرح اپنی بے عزّتی کا بدلہ لے۔

اسد عرشی کا چچا زاد بھائی تھا۔ عرشی کے چچا غریب تھے، اِس لئے عرشی اسد کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بات بے بات اُس سے بُری طرح لڑ پڑتا۔ اگر زیادہ غصّہ آتا تو اُس کے ایک آدھ تھپّڑ بھی جڑ دیتا، جسے وہ ہنس کر ٹال دیتا۔

اور آج تو عجیب ہی بات ہو گئی۔ عرشی اور اسد اپنے امّی ابّو اور عرشی کے ماموں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ماموں نے ٹیبل پر سے کاپی اُٹھا کر پڑھی۔ اُس میں چند کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ کاپی اسد کی تھی۔ ماموں جان نے اسد اور عرشی سے کہا "کہانیاں تو بہت اچھّی ہیں۔ یہ کاپی کس کی ہے؟"

اِس سے پہلے کہ اسد کچھ کہتا، عرشی بول اُٹھا "ماموں جان، یہ کاپی میری ہے اور یہ کہانیاں بھی میں نے لکھی

ہیں"۔

اسد کہنے لگا "عرشی بھائی' یہ کاپی تو میری ہے' اور یہ کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں"۔

بس پھر کیا تھا۔ عرشی کے غُصّے کی اِنتہا نہ رہی۔ اُس نے اسد کو خوب بُرا بھلا کہا۔ لیکن اسد خاموش رہا۔

ماموں جان نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگے:

"ارے بھئی' اِس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔ ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ تم دونوں میں سے جس کی کہانیاں ہیں' وہ مجھے ان کہانیوں کے نام بتا دے"۔

اب تو عرشی بری طرح پھنس گیا۔ سوچنے لگا کہ کہانیوں میں جِن' پریاں اور بادشاہ' ملکہ وغیرہ ہوں گے۔ کہنے لگا:

"ایک تو بادشاہ اور شہزادے کی کہانی ہے' دوسری ایک پری کی ہے' جسے ایک خوف ناک جن اُٹھا کر لے گیا تھا اور اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا"۔

ماموں جان کہنے لگے "عرشی' تم نے غلط کہا۔ اِن پانچ کہانیوں میں سے کوئی بھی کہانی جِنوں پریوں یا بادشاہ وغیرہ کی نہیں ہے۔ یہ کہانیاں جاسوسی اور سائنسی ہیں۔ اور ایک بات یاد رکھنا' عرشی۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ جھوٹ کی وجہ سے انسان کی بے عزّتی ہو جاتی ہے"۔

عرشی وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور اسد سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور پھر اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ وہ مسکرانے لگا۔

دوپہر کے وقت' جب ماموں اپنے کمرے میں نہیں تھے' عرشی چُپکے سے اُن کے کمرے میں گیا۔ وہاں پلنگ کے پاس' سائڈ ٹیبل پر' ماموں جان کی گھڑی رکھی تھی۔ اُس نے گھڑی اُٹھالی اور کمرے سے نکل گیا۔ اب اُس کا رُخ اسد کے کمرے کی طرف تھا۔ اُس وقت اسد بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ عرشی نے جلدی سے ماموں کی گھڑی اسد کی کپڑوں کی الماری میں رکھ دی اور گھر سے باہر آگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب ماموں جان اپنی گھڑی ڈھونڈیں گے اور اُن کی گھڑی اسد کے کمرے سے ملے گی تو.....

وہ اپنی سوچوں میں مگن جانے کب باہر سڑک پر آگیا تھا۔ اچانک اُسے پیچھے سے کسی نے دھکّا دیا اور وہ فٹ پاتھ پر جا گرا۔ پھر بریک لگنے اور کسی کی چیخ کی آواز آئی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تو اسد ایک کار کے سامنے خون میں لت پت پڑا تھا۔

اسد کو اِس حالت میں دیکھ کر عرشی کی سمجھ میں آگیا کہ اسد نے اُسے پیچھے سے دھکّا دے کر بچایا مگر وہ خود نہ بچ سکا۔

عرشی کے صرف چند خراشیں آئی تھیں۔ وہ فوراً اُٹھ کر اسد کی طرف دوڑا اور اُسے زخمی دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُن صاحب نے' جن کی کار سے اسد کا ایکسی ڈنٹ ہوا تھا' اسد کو اُٹھا کر کار میں ڈالا اور عرشی کو ساتھ لے کر ہسپتال گئے۔ یہاں سے عرشی نے فون پر اپنے گھر اِطّلاع دی۔ سب گھر والے فوراً ہسپتال پہنچ گئے۔ اسد کے ہوش میں آنے کے بعد عرشی نے سب کے سامنے اُس سے اپنی غلطیوں کی مُعافی مانگی۔ اُس نے اُسے مُعاف کر دیا۔ (چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)۔

شرارت

محمّد یامین' اِقبال کالونی سرگودھا

حامِد اور عابِد' دونوں بھائی' بہت شرارتی تھے۔ اُن کے ماموں' جن کا نام علی تھا' بہت ڈرپوک تھے۔ دونوں بھائیوں نے اُنہیں ڈرانے کا پروگرام بنایا۔

ایک رات جب علی ماموں اپنے کمرے میں بیٹھے ایک رسالے کا مُطالعہ کر رہے تھے' اُنہوں نے اپنے کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز سُنی۔ وہ اُٹھے اور دروازہ کھولا۔ لیکن باہر کسی کو نہ پا کر بہت حیران ہوئے۔ پھر اچانک اُنہیں کھڑکی سے کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے

پلٹے تو یہ دیکھ کر اُن کے اوسان خطا ہو گئے کہ کھڑی پر ایک سانپ لٹکا ہوا ہے۔

ابھی وہ سانپ کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اُنہیں ایسا محسوس ہوا جیسے صحن میں کوئی چل پھر رہا ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکلے تو یہ دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچے کہ صحن میں ایک بھوت، جس کے بدن پر کالی چادر لپٹی ہوئی تھی، چل رہا ہے۔ بھوت اُن کو دیکھ کر اُن کی طرف بڑھا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جانے کے لئے پلٹے تو دوسرے بھوت کو دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

گھر والے اُن کے گرنے کی آواز سُن کر جاگ گئے۔ وہ باہر نکلے تو ماموں کو زمین پر پڑا دیکھا۔ حامد اور عابد ایک طرف سہمے کھڑے تھے۔ گھر والوں نے فوراً ماموں کو چارپائی پر لٹایا اور ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود کوشش کے اُن کو ہوش نہ آیا تو ہسپتال لے گئے۔ آخر آٹھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ماموں کو ہوش آگیا۔ حامد اور عابد نے اُن سے مُعافی مانگی اور آیندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ (پانچواں اِنعام: 30 روپے کی کتابیں)۔

باجرہ

محمّد زبیر خاں زُبیری، گاؤں گڑھا شاہ دلیہ۔

"آج امّی جان نے ہمارے لئے نئی ڈِش پکائی ہے" میری بہن زوبیا نے میرے اور میرے چھوٹے بھائی محمّد افضل کے سامنے باجرے کی روٹی رکھتے ہوئے کہا۔ باجرے کی روٹی کو دیکھتے ہی افضل کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ چیخ کر بولا "میں باجرے کی روٹی نہیں کھاؤں گا"۔

"کیوں بھئی؟ تم باجرے کی روٹی کیوں نہیں کھاؤ گے؟ وہ دیکھو، زوبیا مکھن اور لسّی لے آئی ہے۔ واہ بھئی واہ، زوبیا۔ تم نے تو نئی ڈِش کا مزہ ہی دوبالا کر دیا" امّی نے کہا۔

"میں باجرے کی روٹی نہیں کھاؤں گا، نہیں کھاؤں گا" افضل نے چیخ کر کہا۔

"میرا پوتا کیوں چلّا رہا ہے؟" دادا جان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"دادا جان، یہ باجرے کی روٹی نہیں کھاتا" میں نے اُنہیں بتایا۔

"تو یہ بات ہے" دادا جان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سُنو، بیٹا۔ باجرہ بہُت قوّت بخش غِذا ہے۔ یہ ہمارے جسم میں طاقت پیدا کرنے کے عِلاوہ بہُت سی بیماریوں کا عِلاج بھی ہے۔ آج کل ہمارے ملک میں بہُت سے لوگ پیٹ کی بیماریوں میں مُبتلا ہیں اور دن رات پیٹ ہلکا کرنے، گیس دُور کرنے اور اعصابی تناؤ کم کرنے کی دوائیں کھاتے رہتے ہیں۔ اگر وہ ناشتے میں باجرے کی روٹی کھائیں تو اِن بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔ پیٹ کی بیماریوں کے عِلاوہ باجرہ نزلہ زکام کو بھی آرام پہنچاتا ہے۔

"قُدرت نے اِس اناج میں ہڈّیاں مضبوط بنانے والے حیاتین الف اور ب بھی شامل کر دیے ہیں۔ اِس اناج کی آدھی چھٹانک مِقدار کھانے سے ہمارے بدن میں ایک سو دو حرارے (کلوریز) پیدا ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو نزلہ زکام اور کنپٹیوں کی جکڑن کی شکایت ہو، وہ صبح کو تین چھٹانک باجرے کے آٹے میں ایک پاؤ دُودھ ملا کر اُس کا حریرہ بنائیں اور صبح کو اِستعمال کریں۔ اِس سے پُرانے سے پُرانا نزلہ بھی خدا کے فضل سے دور ہو جائے گا۔ جن مریضوں کا پیٹ بڑھ جائے تو ایسے مریض باجرے کے دلیے کے سِوا کچھ نہ کھائیں۔ بھوک تنگ کرے تو صرف دودھ پئیں۔ اِن شاء اللہ اُن کا پیٹ کم ہو جائے گا"۔

"دادا جان، اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ باجرے کے اِتنے فائدے ہیں تو میں اِنکار نہ کرتا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ صبح کو ناشتے میں باجرے کی روٹی کھایا کروں گا اور اپنے آپ کو بیماریوں سے بچاؤں گا" محمّد افضل نے خوش ہو کر کہا۔

(چھٹا اِنعام: 25 روپے کی کتابیں)۔

دو سردار

محمد یونس حسرت

یہ آج سے 9 سو سال پہلے کی بات ہے' مسلمانوں کی عبّاسی سلطنت کم زور ہو رہی تھی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں تُرک سرداروں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں جو بغداد کے عبّاسی خلیفہ کی برائے نام وفاداری کا دم بھرتی تھیں۔ شام اور فلسطین پر بھی بعض تُرک رئیسوں کی حکومت تھی۔ اگرچہ اُنھوں نے عیسائیوں کے مذہبی مُعاملات میں کبھی دخل نہ دیا تھا اور عیسائیوں کو اعلیٰ سرکاری عُہدے بھی دیئے تھے' مگر بعض مُتعصّب پادریوں نے یورپ میں مسلمان حاکموں کے مظالم کے فرضی قصّے بیان کر کے یورپ کے عیسائی باشندوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر اُکسایا اور اُن سے کہا کہ وہ بَیتُ المقدس کو مسلمانوں سے چھین کر وہاں دوبارہ عیسائی سلطنت قائم کرلیں۔

اُس وقت یورپ میں ہی نہیں' ساری دُنیا میں اِسلامی ملکوں کی دولت کا چرچا تھا۔ یورپی حاکموں اور سوداگروں کے دِلوں میں اِسلامی ملکوں کی دولت حاصل کرنے کی خواہش چُٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ چُناں چہ مُتعصّب پادریوں کے پیدا کیے ہوئے مذہبی جوش کے ساتھ ساتھ دُنیاوی لالچ اور لُوٹ کھسوٹ کے جذبے نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے قبضے سے فلسطین کو چُھڑانے پر آمادہ کیا۔ عیسائی پادریوں کی جوشیلی تقریریں برابر جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ چُناں چہ 1097ء میں فرانس' اِٹلی اور سِسلی کے عیسائی بادشاہوں نے مِل کر مسلمانوں کے علاقوں پر پہلا حملہ کیا' اور پھر اُن کے حملوں کا یہ سِلسِلہ دو سو سال تک جاری رہا۔ چُوں کہ اِن لڑائیوں میں عیسائی سپاہی اپنے گلوں میں صلیب لٹکاتے اور جھنڈوں پر بھی صلیب کا نشان بناتے تھے' اِس لِئے لڑائیوں کے اِس سِلسِلے کو صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے۔

1099ء میں یورپ کی عیسائی فوجوں نے بیتُ المقدس پر قبضہ کر کے مسلمان مردوں' عورتوں اور بچّوں کا قتلِ عام کیا۔ 70 ہزار مسلمان صرف مسجدِ اَقصیٰ کے سامنے شہید کر دیئے گئے۔ عرب' اِیران اور عراق کے مسلمان حاکم اپنے اندرونی جھگڑوں کے باعث فلسطین کے مسلمانوں کی کوئی اِمداد نہ کر سکے اور اِس طرح 90 سال تک بیتُ المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ رہا۔

آخر عالمِ اِسلام کے اُفق پر سُلطان صلاحُ الدّین ایّوبی جیسا بہادُر اور دِلیر جرنیل نمودار ہوا' جس نے عیسائیوں سے بیتُ المقدس چھین لیا اور اپنی بے مثال بہادُری اور جُرأت کے عِلاوہ فراخ دلی اور رواداری سے عیسائیوں کو اِس قدر حیران کر دیا کہ وہ آج تک اُس کی غیر معمولی بہادُری اور فیّاضی کے گُن گاتے ہیں۔

عالمِ اِسلام کا یہ نام وَر مجاہد 1138ء میں پیدا ہوا۔ اُس کے والِد کا نام نجمُ الدّین تھا جو ایک کُرد سردار تھا۔ جب سُلطان نورُ الدّین زنگی نے دمشق پر قبضہ کیا تو صلاحُ الدّین کے والِد نجمُ الدّین نے سُلطان نورُ الدّین زنگی کی مُلازمت اِختیار کر لی۔ اِس طرح سلطان نورُ الدّین کے دربار میں صلاحُ الدّین کی آمدورفت کا سِلسِلہ شروع ہوا۔ اِس سے پہلے اُس کا زیادہ وقت دینی کتابوں کے مُطالعے یا عبادت میں گزرتا تھا۔ سُلطان نورُ الدّین زنگی نے صلاحُ الدّین کے دل میں اِسلام سے مَحبّت اور جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے عِلاوہ اُسے سپاہ گری کے فنُون میں بھی طاق کر دیا۔

سلطان نور الدین زنگی کی وفات کے کچھ عرصے بعد بغداد کے عبّاسی خلیفہ نے شام اور مصر دونوں کا اِنتظام صلاح الدّین کے سُپرد کر دیا اور اُسے سُلطان کا لقب بھی عطا کیا۔

اُن دنوں صلیبی جنگیں زوروں پر تھیں اور لیبیا سے شام تک کا عِلاقہ جنگوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ سلطان صلاح الدّین نے سیاسی قُوّت حاصل کرنے کے بعد عیسائی لشکروں کی طرف توجّہ کی اور اُنہیں شِکستیں دے کر اُن سے بیتُ المقدس واپس چھین لیا۔ عیسائیوں نے تو بیتُ المقدس پر قبضہ کر کے وہاں کے تمام مسلمان مردوں' عورتوں اور بچّوں کو تہ تیغ کر دیا تھا' مگر سُلطان صلاحُ الدّین نے تمام عیسائی رِعایا کو مُعافی دے دی۔

بیتُ المقدس کے چھن جانے سے سارے یورپ میں تہلکہ مچ گیا۔ عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری پاپائے روم کے کہنے پر فرانس' انگلستان' آسٹریا اور جرمنی کے عیسائی حاکموں نے اپنے لشکروں کے ساتھ بیتُ المقدس کا رُخ کیا مگر اکیلا سلطان صلاحُ الدّین تمام یورپ کا دِلیری سے مقابلہ کرتا رہا اور زیادہ تعداد کے باوجود عیسائی فوجیں بیتُ المقدس کو فتح کرنے میں ناکام رہیں۔

اِن لڑائیوں میں سلطان صلاح الدین نے اپنی شُجاعت اور جواں مردی کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز رحم دلی' فیّاضی اور فراخ دلی کا ثبوت بھی دیا۔ ایک لڑائی کے دوران میں انگلستان کے بادشاہ' رِچرڈ شیر دِل کا گھوڑا مارا گیا تو سلطان صلاح الدین نے اُسی وقت رِچرڈ کو ایک قیمتی گھوڑا بھجوا دیا تاکہ انگلستان کا بادشاہ پیدل لڑنے نہ پائے۔ ایک اور موقع پر رچرڈ بیمار ہُوا تو سلطان صلاح الدین طبیب بن کر اُس کا علاج کرنے گیا۔

سلطان صلاح الدین نے 1196ء میں وفات پائی۔ اُس کی وفات کے بعد یورپ کے عیسائی ملکوں نے پانچ مرتبہ اِسلامی ملکوں پر چڑھائی کی' مگر ہر دفعہ اُنہیں شِکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ دو سو سال پر پھیلے ہوئے صلیبی جنگوں کے اِس

سلسلے نے جس ایک کردار کو سب سے زیادہ شہرت دی ہے، وہ سلطان صلاح الدین کا کردار ہے۔ وہ ایک پاک باز، نیک دل اور بہادر مجاہد تھا جس کی بہادری اور فیاضی کے تذکرے آج بھی یورپ کے ناولوں اور افسانوں میں ہوتے رہتے ہیں۔

یہ کہانی سلطان صلاح الدین کی زندگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہونے کے باوجود اس کی بہادری اور فیاضی کا بھرپور نمونہ ہے جس کی وجہ سے یورپ کے لوگ آج تک اس کے گن گا رہے ہیں۔

سردار تابر ڈی انگلستان کا مانا ہوا سورما تھا۔ سارے انگلستان میں اس کی بہادری اور دلیری کی شہرت تھی۔ اس نے شاہِ انگلستان کی طرف سے کئی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ان جنگوں میں اس کی شان دار کارکردگی کے باعث شاہِ انگلستان نے اسے "سر" کا خطاب دیا تھا۔ چناں چہ انگلستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ سردار تابر ڈی کا نام بڑے ادب اور احترام سے لیتے تھے۔

جب تابر ڈی عیسائی پادریوں کی جوشیلی تقریروں سے متاثر ہو کر انگلستان کے اور بہت سے سپاہیوں کے ساتھ فلسطین کی طرف روانہ ہوا تو لوگوں نے اسے نہایت دھوم دھام سے رخصت کیا۔ انگلستان کے لوگوں کو پوری توقع تھی کہ جس طرح سردار تابر ڈی نے انگلستان کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے، اسی طرح وہ فلسطین میں بھی دلیری اور بہادری کے کارناموں پر کارنامے دکھائے گا اور اس کی شجاعت کی بدولت عیسائیوں کا بیت المقدس پر قبضہ کرنے کا خواب پورا ہو جائے گا۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فلسطین میں عیسائی فوجوں اور سلطان صلاح الدین کے درمیان پہلے بھی کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ مگر اس بار جب عیسائی فوجوں نے چڑھائی کی تو ان کا جوش و خروش پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ اپنے درمیان سردار تابر ڈی جیسے دلیر اور بہادر جنگ جو کی موجودگی کی وجہ سے عیسائی سپاہی یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے شکست کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر سلطان صلاح الدین نے پہلے کی طرح اس بار بھی عیسائی فوجوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں سردار تابر ڈی کا گھوڑا بدک کر بے قابو ہوا تو سردار تابر ڈی گھوڑے کی پیٹھ سے لڑھک کر زمین پر آ رہا۔ اس کے زمین پر گرتے ہی مسلمان مجاہدین نے آگے بڑھ کر اسے قید کر لیا۔

اس جنگ میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں عیسائی سپاہی قید ہو گئے تھے۔ مسلمان مجاہدین نے ان تمام جنگی قیدیوں کو سلطان صلاح الدین کے حضور پیش کیا۔ سلطان نے خود ایک ایک عیسائی قیدی سے بات کی اور اس کے عیسائی فوج میں مرتبے اور اس کی جنگی قابلیت کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے میں فدیے کی رقم مقرر کی۔ عام عیسائی سپاہیوں کے لئے فدیے کی رقم فی سپاہی ایک سو اشرفی مقرر ہوئی۔

چھوٹے سرداروں کے لئے فدیے کی رقم پانچ سو اشرفیاں طے ہوئی اور سردار تابر ڈی جیسے اعلیٰ فوجی عہدے داروں کو

ایک ہزار سے لے کر آٹھ ہزار اشرفیاں ادا کرنے کا حکم ہوا۔

جب سردار تابڑی کی باری آئی تو سُلطان صلاحُ الدّین نے اُس سے مُخاطِب ہو کر کہا:

"اے اِنگلستان کے دِلیر اور بہادُر سردار! ہم نے اپنی آنکھوں سے تمہیں میدانِ جنگ میں بڑی دِلیری اور بے خوفی سے لڑتے دیکھا ہے۔ تمہاری بہادُری اور شجاعت میں کلام نہیں۔ مگر جیت' جیت اور شکست' شکست ہوتی ہے۔ تمہاری تمام دِلیری اور شجاعت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں تم پر فتح بخشی ہے۔ چُوں کہ تمام جنگی قیدیوں کی رِہائی کے عِوَض فِدیے کی رقم اُن کے مرتبے کے لحاظ سے مُقرّر کی جا رہی ہے' اِس لئے تمہارے مرتبے اور جنگی قابلیّت کے مُطابِق تمہاری فِدیے کی رقم آٹھ ہزار اشرفیاں مقرر کی جاتی ہے۔ تم آٹھ ہزار اشرفیاں ادا کر کے ابھی اور اِسی وقت آزاد ہو سکتے ہو۔ مگر جب تک ہمیں یہ رقم نہیں مِلتی' اُس وقت تک تم ہماری قید میں رہوگے"۔

سردار تابڑی نے جواب دیا:

"مُعزّز سُلطان! میں اپنا گھوڑا اور اپنی ساری زمین بھی بیچ ڈالوں تو بھی اِتنی بڑی رقم حاصِل نہیں کر سکتا۔ میں آٹھ ہزار اشرفیاں کہاں سے لاؤں گا؟"

سُلطان صلاحُ الدّین نے کہا "تو پھر تم ہمیشہ کے لئے ہماری قید میں رہو گے۔ ہاں' تم کسی اور طریقے سے یہ رقم جمع کر سکو تو اور بات ہے"۔

سردار تابڑی نے کہا "مُعزّز سلطان! اِس کی صورت ہو سکتی ہے۔ آپ مجھے اپنے جنگی کیمپ میں واپس جانے کی اِجازت دے دیں۔ میں اپنے دوستوں سے اِمداد طلب کروں گا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں 30 دن کے اندر اندر یہ رقم جمع کر کے دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا"۔

"اور اگر تم یہ رقم جمع نہ کر سکے تو؟"

سردار تابڑی نے کہا "تو پھر بھی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور آپ مجھ سے جو سُلوک چاہیں کر سکتے ہیں"۔

سردار تابڑی کی بات سُن کر مسلمان مجاہدین بے ساختہ قہقہے لگانے لگے۔ اُن کے نزدیک سردار تابڑی کی بات سراسر بے وقوفی کی بات تھی۔ بھلا سلطان صلاح الدین ایک قیدی عیسائی سردار کو محض اُس کی زبان پر اِعتبار کر کے کیسے آزاد کر سکتا تھا؟

مگر سردار تابڑی کی بات سُن کر سلطان صلاح الدین نے قہقہہ نہیں لگایا۔ اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا:

"سردار تابڑی! اگر تم ہمیں یہ قول دو کہ تم تیس دن کے اندر اندر اپنے فِدیے کی رقم لے کر واپس حاضر ہو جاؤ گے تو ہم تمہیں آزاد کر سکتے ہیں"۔

سردار تابڑی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا:

"میں قول دیتا ہوں' مُعزّز سُلطان! اور یہ قول ایک بہادُر سُورما کا قول ہے"۔

سلطان صلاح الدین نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا:

"لیکن یاد رکھو سردار تابڑی! اگر تم رقم کے بغیر واپس آئے تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا"۔

سردار تابڑی نے دوبارہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"میں تیس دن کے اندر اندر واپس آ جاؤں گا' مُعزّز سلطان! خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں"۔

سلطان صلاح الدین نے سردار تابڑی کو رِہا کر دیا۔ رِہائی کے بعد وہ عیسائی سپاہیوں کے کیمپ میں پہنچا تو وہ اُسے دیکھ کر حیران رہ گئے اور پُوچھنے لگے:

"تم نے سلطان صلاح الدین کو اپنی رہائی پر کیسے آمادہ کر لیا؟ مسلمان تو فِدیہ وصول کئے بغیر کسی قیدی کو نہیں چھوڑتے"۔

سردار تابڑی نے جواب میں کہا:

"سلطان صلاحُ الدّین نے مجھے رِہا نہیں کیا۔ بلکہ اُس نے مجھے فِدیے کی رقم جمع کرنے کے لئے تیس دن کی مُہلت دی ہے۔ اِس مُدّت کے ختم ہونے پر مجھے واپس

سلطان کے پاس جانا ہوگا' خواہ میرے پاس فِدیے کی رقم ہو یا نہ ہو"۔

"پھر تو تم آزاد ہو" سردار تابڑی کے عیسائی ساتھی کہنے لگے "سلطان صلاح الدین ہمارا دُشمن ہے۔ تمہیں اپنے دشمن کے ساتھ کیا ہُوا وعدہ پورا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔

سردار تابڑی نے غصّے سے کہا "تمہاری باتیں سُن کر مجھے شرم آتی ہے۔ میں نے سلطان صلاح الدین کو قول دیا ہے اور ایک جاں باز کو اپنا قول اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ میں اپنے قول پر قائم رہوں گا۔ چاہے اِس کے لئے مجھے اپنی جان کی قربانی دینی پڑے"۔

سردار تابڑی کے دوستوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ وہ سلطان صلاحُ الدّین کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کا خیال دل سے نکال دے مگر وہ ایسا سوچنے کے لئے بھی تیّار نہ تھا۔ پھر جب اُس نے اپنی فِدیے کی رقم جمع کرنے کے لئے دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا تو اُن میں سے اکثر نے کسی نہ کسی بہانے صاف اِنکار کر دیا۔ اُن کے نزدیک ایک آزاد شخص کا اپنے فِدیے کی رقم ادا کرنا سراسر حماقت تھی اور اپنے دشمن کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنا اِس سے بھی بڑی حماقت۔ وہ تو سمجھتے تھے کہ دشمن کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سردار تابڑی اپنے ساتھیوں کے طعنے اور جلی کٹی باتیں سُنتا اور ایک ایک کے سامنے رقم کے لئے ہاتھ پھیلاتا رہا۔ اُس کی بہادُری اور دِلیری کو سب مانتے تھے۔ مگر اُس کی مالی اِمداد کرنے کو تیّار نہ تھے' کیوں کہ اُن کی نظروں میں سردار تابڑی کے سلطان صلاح الدین سے کئے ہوئے وعدے کی کوئی اہمیّت نہ تھی۔ وہ صاف کہتے تھے کہ سردار تابڑی اِس وعدے کو پورا کرنے پر اِصرار کر کے زبردست حماقت کر رہا ہے۔

ایک ایک کر کے تیس دن گزر گئے۔ اِس مُدّت کے

ختم ہونے پر سردار تابڑی کے پاس صرف چار سو اشرفیاں جمع ہو سکی تھیں۔ ایک اُداس اور بوجھل دل کے ساتھ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور مسلمان مجاہدین کے کیمپ کی طرف چل دیا۔

مسلمان مجاہد سردار تابڑی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اُن میں سے کسی کو بھی یہ توقّع نہ تھی کہ ایک عیسائی سردار اپنے دشمن سے کیے ہوئے وعدے پر قائم رہے گا۔ اُنہوں نے اُسے فوراً سُلطان صلاحُ الدّین کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان صلاح الدین نے اُسے دیکھتے ہی کہا:

"سردار تابڑی! ہمیں خوشی ہے کہ تم اپنے وعدے پر قائم رہے ہو۔ مگر یہ بتاؤ کہ فِدیے کی رقم بھی لائے ہو؟"

سردار تابڑی نے افسوس سے سر جُھکا کر کہا "میں صرف چار سو اشرفیاں جمع کر سکا ہوں۔ اِس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں مِل سکا"۔

"اور اِس کے باجود تم واپس آ گئے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا؟" سلطان نے کہا۔

سردار تابڑی نے بڑے اِطمینان سے جواب دیا "میں

نے اِس کا قول دیا تھا' مُعزّز سلطان' اور میں اپنے قول کا پکّا ہوں"۔

سردار تابر ڈی کی یہ بات سُن کر سلطان صلاح الدین اپنے سالاروں سے مُخاطِب ہُوا:

"دیکھو! اِس قابلِ عِزّت سردار کو دیکھو! یہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی اپنے دُشمن سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرتا ہے۔ یقیناً یہ بات ہماری شان کے خلاف ہو گی کہ ہم اِس کے بدلے اِسے قتل کرا دیں۔ نہیں۔ ہم صلیب کے پرچم تلے لڑنے والے عیسائی جنگ جُوؤں کو دِکھائیں گے کہ ہم وعدے کی آن رکھنے والوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ تم میں سے کون کون سردار تابر ڈی کے فِدیے کی رقم میں اپنا حِصّہ ڈالنا پسند کرے گا؟"

سُلطان صلاحُ الدّین نے یہ کہتے ہوئے ایک خاصا بڑا تھال اپنے سالاروں اور سپاہیوں کی طرف بڑھا دیا۔ یہ تھال اُن کے درمیان گردِش کرتا رہا اور وہ اُس میں مُٹھی دو مُٹھی اشرفیاں ڈالتے رہے۔ تھال جب دوبارہ سلطان صلاح الدین کے سامنے پہنچا تو وہ اشرفیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے اِن تمام اشرفیوں کو گِنا اور پھر سردار تابڑی سے مُخاطِب ہو کر کہا:

"اِس تھال میں دس ہزار اشرفیاں ہیں۔ ہم اِن میں اپنی طرف سے دس ہزار اشرفیاں اور شامل کر دیتے ہیں۔ سردار تابر ڈی! تمہارے فِدیے کی رقم اصل رقم سے کئی گُنا زیادہ ہو چکی ہے۔ تم آزاد ہو اور یہ 20 ہزار اشرفیاں بھی تم اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ یہ تمہارے لئے ہماری طرف سے تحُفہ ہے"۔

سردار تابر ڈی نے جواب دیا "میں یہ تحُفہ قبول نہیں کر سکتا' معزّز سلطان!"

"کیوں؟" سلطان نے تعجّب سے پوچھا۔

سردار تابر ڈی نے چند لمحے خاموشی اِختیار کی پھر کہنے لگا:

"مُعزّز سلطان! میں یہ دولت اپنی اکیلی ذات کے لئے کیسے قبول کر سکتا ہوں' جب کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے ہزاروں ساتھی ابھی تک آپ کی قید میں ہیں۔ آپ یہ بیس ہزار اشرفیاں اپنے پاس رکھ لیجئے اور اِنہیں میری طرف سے میرے ساتھیوں کا فِدیہ سمجھ لیجئے"۔

سلطان صلاح الدین نے اُٹھ کر سردار تابر ڈی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا:

"سردار تابر ڈی! یہ بیس ہزار اشرفیاں تمہارے ہی پاس رہیں گی۔ جب تم یہاں سے جاؤ تو اپنے ساتھی قیدیوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے جانا۔ وہ آزاد ہیں۔ اُن کے فِدیے کی رقم ہم ادا کر دیں گے"۔

سلطان صلاح الدین نے اُسی وقت اُن تمام عیسائی سپاہیوں کو آزاد کر دیا جو مسلمان مُجاہدین نے سردار تابر ڈی کے ساتھ گرفتار کیے تھے اور سردار تابر ڈی اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس عیسائیوں کے جنگی کیمپ میں پہنچ گیا۔ عیسائی سپاہی سردار تابر ڈی اور اُس کے ساتھیوں کے زندہ سلامت واپس آنے پر بہُت خوش ہوئے اور جب اُنہیں ساری بات معلوم ہوئی تو وہ سلطان صلاح الدین کے جانی دُشمن ہونے کے باوجود اُس کی بے مثال فیّاضی اور فراخ دِلی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

کئی برس بعد جب سردار تابر ڈی واپس اِنگلستان پہنچا تو اُس کی کہانی بھی اُس کے ساتھ اِنگلستان پہنچ گئی۔ اُس نے خاصی لمبی عُمر پائی۔ جب وہ باہر نکلتا تھا تو لوگ اُس کی طرف اِشارہ کر کے کہتے تھے:

"دیکھو! وہ جا رہا ہے سردار تابر ڈی۔ دُنیا نے اِس سے زیادہ شریف اور وعدے کا پابند آج تک نہیں دیکھا"۔

مگر لوگوں کی یہ بات سُن کر فخر سے سینہ پُھلانے کی بجائے سردار تابر ڈی جواب میں کہتا تھا:

"نہیں' دوستو! اِس دُنیا کا سب سے شریف سردار تو وہ ہے جو کبھی میرا دُشمن تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ عِزّت کیا ہے' اور فیّاضی کسے کہتے ہیں۔ مُجھ جیسے دُنیا میں اور بہُت سے ہوئے ہیں اور ہوں گے' مگر سُلطان صلاحُ الدّین سے زیادہ شریف فوجی سردار نہ کوئی ہُوا ہے نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا"۔

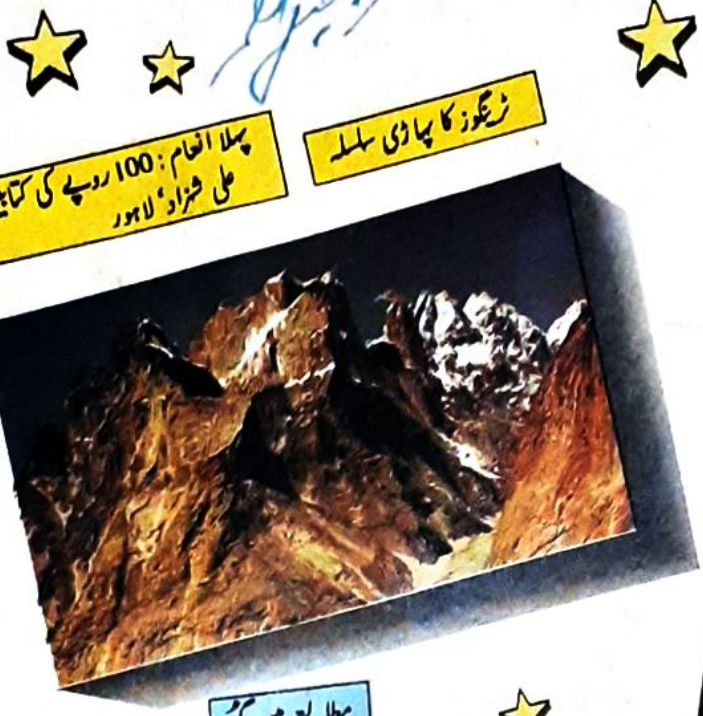

ہونہار فوٹوگرافر

منگلا ڈیم

تیسرا انعام: 70 روپے کی کتابیں
احمد رضا سید، لاہور

ٹرنگوز کا پہاڑی سلسلہ

پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں
علی شہزاد، لاہور

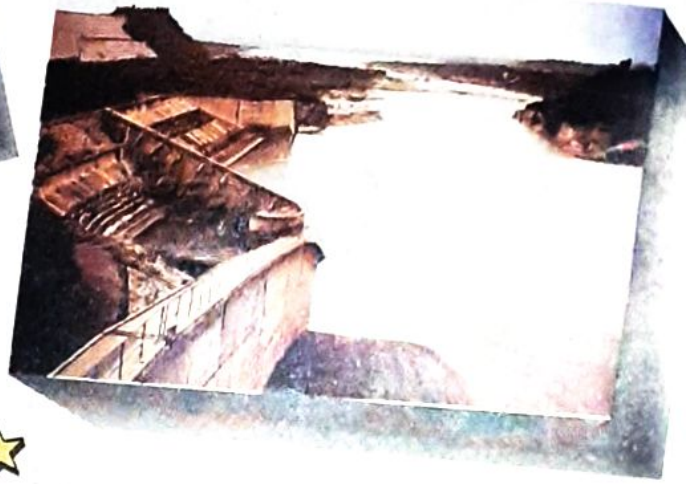

مطالعے میں گم

دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں
فرحانہ خلیل، کراچی

پی اے ایف بیس، پتراٹہ

چوتھا انعام: 55 روپے کی کتابیں
سید محرم حسین شاہ، لاہور

ہدایات

تصویر رنگین اور پوسٹ کارڈ سائز کی ہونی چاہیے۔ موضوع کی کوئی قید نہیں۔ اِس مقابلے میں 16 سال تک کے ساتھی حصّہ لے سکتے ہیں۔ تصویر کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔

کوپن

ہونہار فوٹوگرافر

نام ________ عمر ________

پتا ________

قدرت کے عجوبے

آب شارِ وکٹوریا

آج سے 140 سال پہلے (1855ء میں) ایک انگریز سیّاح' ڈیوڈ لِونگ سٹون' افریقہ کی سیر کرتا ہوا "زیم بے زی" دریا کے پاس پہنچا تو اُسے لوگوں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر یہ دریا ایک اُونچی چٹان پر سے نیچے ایک بہت گہرے گڑھے میں گرتا ہے' اور پھر' اُوپر اُچھل کر' آسمان کی طرف جاتا ہے۔

لِونگ سٹون کے دل میں قدرت کے اِس عجوبے کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور وہ چند افریقی باشندوں کے ساتھ' کشتی میں سوار ہو کر' دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ابھی اُس کی کشتی اُس مقام سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھی کہ اُسے ایک ہیبت ناک گرج سُنائی دی اور ساتھ ہی ہَوا میں بُخارات اُڑتے دکھائی دیے۔

یہاں سے تھوڑی دور آگے' دریا کے بیچوں بیچ' ایک چھوٹا سا ٹاپُو (جزیرہ) تھا۔لِونگ سٹون اُس ٹاپو میں اُتر گیا اور وہاں سے دریا کو سیکڑوں فٹ نیچے گڑھے میں گرتے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

دریا کا پانی نیچے گڑھے میں گر کر زور سے اُوپر کو اُچھلتا تو اُس سے گہرے بادل سے بن جاتے اور پھر یہ بادل بارش کی طرح برسنے لگتے۔ اُس وقت سورج مغرب کی طرف تھا۔ اُس کی کِرنیں آبشار کے اُچھلتے ہوئے پانی پر پڑیں تو شمال سے جنوب تک ست رنگی دھنک بن گئی۔ افریقی لوگ اِس آبشار کو اپنی زبان میں "موسی او آٹیونیا" کہتے تھے' جس کا مطلب ہے : دھواں جو گرجتا ہے۔ لِونگ سٹون نے اِس کا نام' انگلستان کی ملکہ وِکٹوریا کے نام پر' آبشار وِکٹوریا رکھا۔

آبشار وِکٹوریا افریقہ کے دو مُلکوں' زمبیا اور زم باب وے کی سرحد پر ہے' اور صرف 355 فٹ اُونچی ہے۔ اِس کے مُقابلے میں جنوبی امریکا کے ایک ملک' وینزویلا' کی آبشار "اینجل" 3212 فٹ اُونچی ہے اور دُنیا کی سب سے اُونچی آبشار مانی جاتی ہے۔ لیکن آبشار وکٹوریا اپنی خوب صورتی کی وجہ سے آبشار اینجل سے زیادہ مشہور ہے۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES
Price Rs. 15.00

ٹریفک قوانین کی پابندی
حادثات سے بچاؤ

[illegible] ٹریفک [illegible] خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے ہر روز اخبارات سڑکوں پر ہونے والے سنگین حادثات کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں والدین اپنے بچوں [illegible] کسی حد تک اپنا بچاؤ کر لیتے ہیں مگر بچوں میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ سڑکوں پر پیش آنے والے حادثات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔
[illegible] اور انہیں ٹریفک کے اصول و ضوابط سے روشناس کروانے کے لیے "**ٹریفک تعلیم برائے اطفال**" شائع کی گئی ہے۔
[illegible] دیدہ زیب السٹریشنز ILLUSTRATIONS سے مزین ہے۔ اس کا مطالعہ پیارے پیارے بچوں کو ٹریفک کے سنگین حادثات سے [illegible] بے حد معاون ثابت ہوگا۔

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور - راولپنڈی - کراچی

سندھ اور بلوچستان [illegible] مہران [illegible] کلفٹن روڈ کراچی فون: 570527 570534-537730

پنجاب 60 شاہراہ قائداعظم - لاہور 301196-98

[illegible] 277 [illegible] راولپنڈی 63503-64273